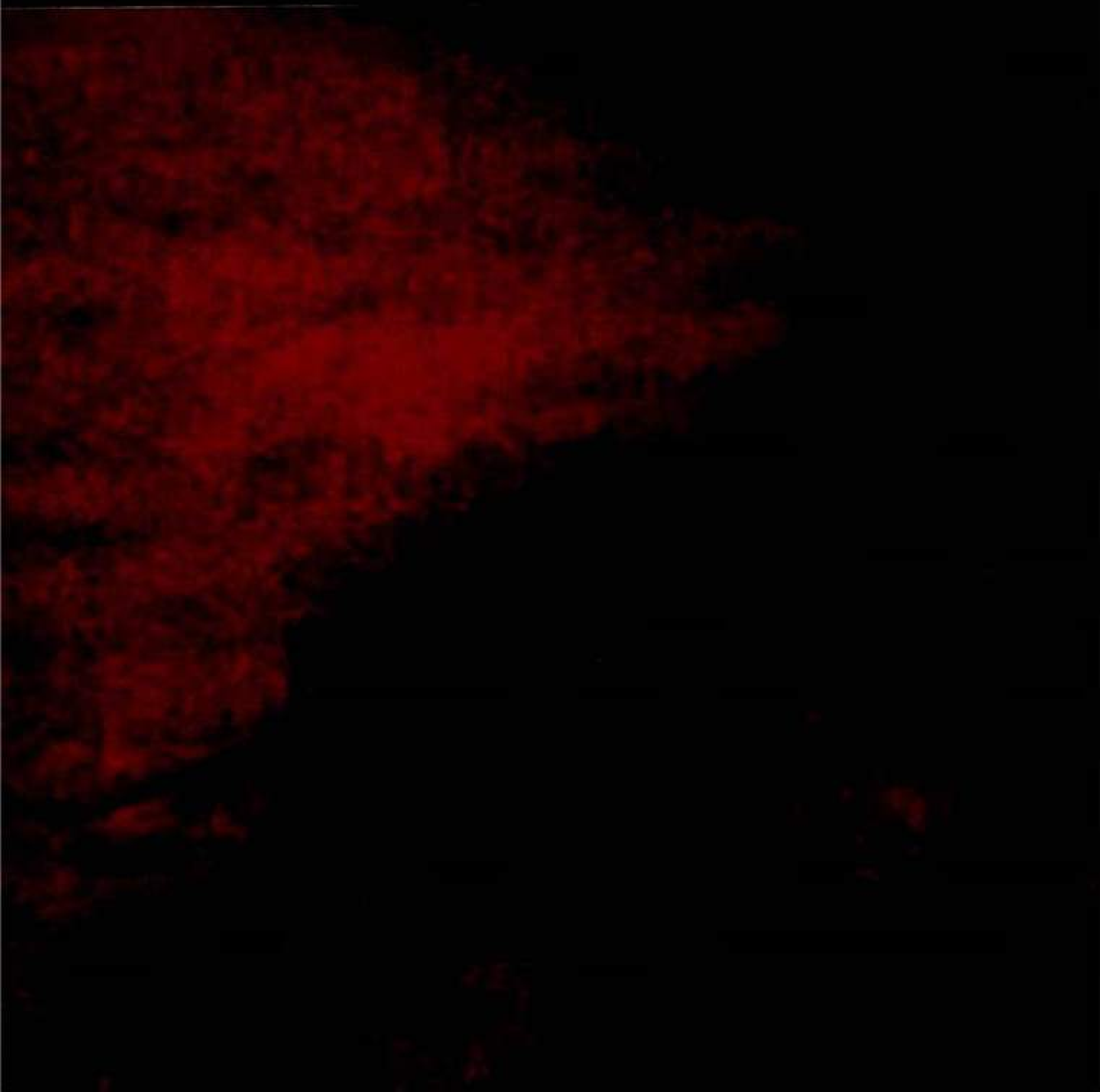
صادق ہدایت

بوف کور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال



صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

بوفِ کور

ISBN 969-8379-01-0

بوفِ کور

(فارسی ناول)

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

پہلی اشاعت: 1984
دوسری اشاعت: 1997
تیسری اشاعت: 2012

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35650623, 35213916 (92-21)
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

صادق ہدایت کو متفقہ طور پر جدید فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ ہدایت 1903 میں تہران کے ایک معزز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا اور وہاں کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1926 میں اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یوروپ بھیجا گیا لیکن اس نے اپنے چار سالہ قیام کو درسی تعلیم کی نذر کرنے کے بجائے یوروپی ادب اور آرٹ سے شناسائی پیدا کرنے میں صرف کیا۔ وہ 1930 میں تہران واپس آیا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ زندہ بگور شائع ہوا۔ 1930 سے 1942 تک کا زمانہ ہدایت کی ادبی زندگی کا سب سے ثمر آور دور تھا۔ تہران لوٹنے کے بعد ہدایت کو چند ہم مذاق دوستوں کا ساتھ میسر آیا جن میں بزرگ علوی، مسعود فرزاد اور مجتبیٰ مینوی شامل تھے۔ یہ چاروں دوست — جنھیں فرزاد نے ازراہِ مذاق "مردمانِ اربعہ" کا نام دیا، اور یہ نام تہران کے ادبی حلقوں میں کسی حد تک مشہور بھی ہوا — ہر روز شام کا وقت اکٹھے گزارتے اور کتابوں اور خیالات کا آپس میں تبادلہ کرتے۔ مگر ہدایت طبعاً تنہا اور قنوطی تھا اور عملی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا جبکہ اس کے ساتھی سیاسی طور پر سرگرم تھے۔ آخر 1937 میں بزرگ علوی کے قید کردیے جانے کے بعد یہ گروپ منتشر ہوگیا۔ بارہ سال کے اس عرصے میں ہدایت کی کہانیوں کے چار مجموعے سہ قطرہ خون (1932)، سایہ روشن (1933)، وغ وغ ساہاب (1933) اور سگِ ولگرد (1942)، ایک طویل کہانی "علویہ خانم" (1933) اور ناول بوفِ کور (1937) شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف دوسرے موضوعات پر بھی

کتابیں لکھیں جن میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (''قضیے'')، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ ہدایت نے کافکا کی شاہکار کہانی Metamorphosis کا ترجمہ مسخ کے نام سے کیا اور اس کے بارے میں ایک طویل تنقیدی مضمون بھی لکھا۔ کافکا کے علاوہ خیام سے بھی اس کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ اس کے بارے میں ہدایت کا ایک طویل مقالہ ''ترانہ ہائے خیام'' کے نام سے رباعیاتِ خیام کے ایک نئے ایڈیشن میں مقدمے کے طور پر چھپا اور اس مقالے نے خیام کے مطالعے میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔

ہدایت کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اس کا قدیم فارس کی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یوروپ سے واپسی پر اس نے پہلوی زبان کی باقاعدہ تحصیل کی اور کئی قدیم زرتشتی مخطوطوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ 1937 کے لگ بھگ ہندوستان کے سفر کے دوران اس نے بمبئی کے پارسیوں سے قدیم زرتشتی صحیفوں کا درس لیا تھا۔ وہ فارس کی قبلِ اسلام کی تہذیب کا بہت گرویدہ تھا اور ایران میں اسلام کی آمد کو عرب فتوحات کا نتیجہ اور ایرانی تمدن میں ایک خارجی عنصر کی آمیزش خیال کرتا تھا۔ اس کے تاریخی ڈرامے ''پروین دخترِ ساسان'' اور ''مازیار'' اس کے اسی جذباتی لگاؤ کا اظہار ہیں اور ادبی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر اس کی شدید طنزآمیز تحریر توپ مرواری اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ یہ کتاب 1990 میں سویڈن سے شائع ہوئی۔

1941 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران پر اتحادی فوجوں کے تسلط اور رضا شاہ اول کی سبکدوشی کے بعد بیرونی طاقتوں کی مرضی سے اس کا بیٹا محمد رضا پہلوی تخت نشین ہوا۔ تب سے لے کر 1953 تک کا زمانہ ایران میں فکر اور تحریر کی نسبتاً آزادی کا تھا۔ مگر اس وقت تک ہدایت اپنے یاس آمیز طرزِ احساس کے باعث اپنے اردگرد کی ہر چیز سے متنفر ہو چکا تھا۔ باقی ماندہ زندگی میں ہدایت کی کہانیوں کا صرف ایک مجموعہ ولنگاری، ایک طویل کہانی ''حاجی آقا'' اور چند طنزیہ خاکے شائع ہوئے۔

زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی گنجلک شخصیت کی نمایاں

خصوصیات تھیں۔ پیرس میں اپنے اولین قیام کے دوران اس نے دریائے سین میں کود کر جان دینے کی کوشش کی تھی، اور ایک اور موقعے پر تریاق کھا کر۔ اس تاریک طرزِ احساس کی وجہیں اس کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اس کے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ ایران میں جینے مرنے سے رفتہ رفتہ بالکل بیزار ہو چکا تھا اور ادب سے مسرت اٹھانے کی حس بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس نے ہندوستان میں جا بسنے کا ارادہ کیا لیکن چند مہینوں سے زیادہ وہاں نہ رہ سکا۔ 1950 میں وہ فرانس چلا گیا اور اپریل 1951 میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

شہرِرے کے نواح میں ایک خستہ و درماندہ شخص اپنی زندگی اور تخلیق کے کابوس کو کاغذ پر منتقل کر رہا ہے تاکہ خود کو پہچان پانے سے پہلے مر نہ جائے۔ اپنی تلاش کا یہ آسیب اسے خود کو دہراتی ہوئی ایک تاریک اور مہیب دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وجودِ انسانی کے ناقابلِ علاج زخم تازہ ہیں۔ ڈراؤنے خوابوں کی یہ دنیا ایڈگر ایلن پو کی دنیا سے مماثل ہے اور اس کی تعبیر وجودیت کے فلسفے کی مدد سے بھی کی جاتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اہم ناول، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک زندہ دستاویز اور فنی معیار کے لحاظ سے ایک مکمل شاہ پارہ ہے، جدید فارسی ادب کو ادبِ عالیہ کے بڑے دھارے سے جوڑ دیتا ہے۔

اس اردو ترجمے کے لیے ناول کے اصل فارسی متن کے علاوہ ڈی پی کاستیلو کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے The Blind Owl کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

بوف کور

زندگی میں کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو تنہائی میں روح کو آہستہ آہستہ گھن کی طرح چاٹتے اور کھاتے رہتے ہیں۔

ان زخموں کی تکلیف کا کسی سے اظہار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ باور نہ آنے والی ان تکلیفوں کو اتفاقات اور انوکھے واقعات میں شمار کرتے ہیں؛ اور اگر کوئی انھیں کہتا یا لکھتا ہے تو رواجی اور ذاتی عقیدوں کی روشنی میں اسے شک یا تمسخر بھری مسکراہٹ سے قبول کرتے ہیں، کیونکہ انسان ابھی تک اس روگ کا کوئی علاج پیدا نہیں کر سکا اور اس کا مداوا صرف شراب کے ذریعے حاصل ہونے والی فراموشی اور افیون یا دوسرے نشوں کی لائی ہوئی نیند ہے۔ لیکن افسوس کہ اس دارو کا اثر عارضی ہے اور ایک مدت کے بعد وہ درد کو تسکین دینے کے بجائے اس کی شدت بڑھانے لگتی ہے۔

کیا کبھی ایسا ہو گا کہ کوئی فطرت سے ماورا ان واقعات کے بھید تک پہنچے اور روح کے سائے کے اس عکس کا راز پائے جو غنودگی میں، نیند اور بیداری کے درمیان کے برزخ میں، ظاہر ہوتا ہے؟

میں ایسے واقعات میں سے صرف ایک کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے میں خود دوچار ہوا ہوں اور جس نے مجھے اس قدر تھکایا ہے کہ میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ جو نشان یہ چھوڑ گیا ہے اس نے میری زندگی کو شروع سے آخر تک اور اتنی گہرائی تک زہر آلود کر دیا ہے جس کا تصور

بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے زہر آلود لکھا ہے، جبکہ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس سے میری زندگی کو جو داغ لگا ہے وہ ازل سے ابد تک پھیل گیا ہے۔

جو کچھ مجھے یاد ہے، جتنا کچھ ان واقعات میں سے میرے ذہن میں باقی رہ گیا ہے، میں اسے لکھ دینے کی کوشش کروں گا۔ کوئی نتیجہ نکالنے کے لیے نہیں، صرف سکون پانے کے لیے، اور اس لیے کہ لوگ میرا یقین کریں۔ ویسے میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ لوگ میرا یقین کرتے ہیں یا نہیں۔ صرف اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں کل خود کو پہچان پانے سے پہلے نہ مر جاؤں۔ زندگی کے تجربوں سے میں نے یہی سمجھا ہے کہ میرے اور دوسروں کے درمیان ایک ہولناک گھاٹی ہے، اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جہاں تک ہو سکے خاموش رہوں اور اپنے خیالات کو اپنے ہی تک رکھوں، اور اب اگر میں نے لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو صرف خود کو اپنے سائے پر ظاہر کرنے کے لیے... وہ سایہ جو دیوار پر جھکا ہوا میرے لکھے ہوئے لفظوں کو بہت بھوک سے نگلتا جاتا ہے، میری یہ کوشش اسی کے لیے ہے۔ سوچتا ہوں شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جان سکیں، کیونکہ جب سے میں نے دوسروں سے رشتہ توڑا ہے، میں خود کو زیادہ اچھی طرح جاننا چاہتا ہوں۔

اکارت سوچیں ہیں یہ — شاید! لیکن انھوں نے کسی حقیقت کے مقابلے میں زیادہ سختی سے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ کیا یہ سب لوگ جو میری شباہت رکھتے ہیں اور جن کی ضرورتیں اور جذبات میری طرح کے ہیں، صرف مجھے فریب دینے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں؟ کیا یہ محض مٹھی بھر سائے نہیں جو میرا مذاق اڑانے اور مجھے دھوکے میں رکھنے کے لیے وجود میں آئے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ جو میں محسوس کرتا ہوں، دیکھتا ہوں یا سوچتا ہوں، سراسر موہوم اور غیر حقیقی نہیں ہے؟

میں صرف اپنے سائے کے لیے لکھتا ہوں جو چراغ کی روشنی میں دیوار پر پڑ رہا ہے۔ مجھے خود کو اس پر ظاہر کرنا ہے۔

محرومی اور بدبختی سے بھری اس ذلیل دنیا میں پہلی بار مجھے گمان ہوا کہ میری زندگی میں سورج کی ایک کرن پھوٹی ہے۔ افسوس، یہ سورج کی کرن نہ تھی بلکہ ایک گزرتی ہوئی پرچھائیں تھی جس نے ایک عورت یا ایک فرشتے کے روپ میں مجھ پر روشنی کی، اور اس لمحے کی چکاچوند میں میں نے اپنی زندگی کی ساری بدبختیوں کو دیکھا اور اس کی عظمت اور شکوہ کو سمجھا، اور پھر یہ پرچھائیں تاریکی کے اس گرداب میں گم ہوگئی جس میں اسے گم ہوجانا تھا۔ میں اس گزرتی ہوئی پرچھائیں کو اپنے واسطے روک نہ سکا۔

تین ماہ... نہیں، دو ماہ اور چار روز ہوتے ہیں کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی ہے، لیکن ان جادوئی آنکھوں کا، ان کے ہلاک کردینے والے شراروں کا تصور ہمیشہ سے میری زندگی میں رہا ہے۔ میں اسے کس طرح بھلا سکتا ہوں جو میری زندگی سے اس قدر وابستہ ہے۔

نہیں، اس کا نام میں نہیں لوں گا۔ کیونکہ جس کی بڑی بڑی اور چمکیلی آنکھوں میں میری زندگی آہستگی اور دردناکی کے ساتھ جل کر پگھل چکی ہے، اس آسمانی، نازک اور روشن جسم والی کا اب اس پست اور ظالم دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ نہیں، میں اس کے نام کو زمینی چیزوں سے آلودہ نہیں کروں گا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے آدمیوں کے قبیلے سے، احمقوں اور خوش بختوں کے قبیلے سے، خود کو بالکل الگ کرلیا اور فراموشی کے لیے شراب اور افیون میں پناہ لی۔ میری

زندگی اپنے کمرے کی چار دیواری میں گزری اور گزر رہی ہے۔ میں ساری زندگی چار دیواری ہی میں رہا ہوں۔ میں سارے دن قلمدان کے ڈھکنوں پر نقاشی کیا کرتا تھا۔ اس کام کے علاوہ میرا سارا وقت شراب اور افیون کے لیے وقف تھا اور قلمدانوں پر نقاشی کا یہ مضحک کام بھی میں نے خود کو بے حس رکھنے اور وقت کاٹنے کے لیے اختیار کیا تھا۔

خوش نصیبی سے میرا گھر شہر سے باہر، لوگوں کی زندگی کے آشوب اور جنجال سے دور، ایک سکون اور خاموشی کی جگہ واقع ہے۔ اس کے اردگرد ویرانے اور خرابے ہیں۔ صرف بہت دور، گلی کے سرے پر، مکان نظر آتے ہیں اور شہر شروع ہوتا ہے۔ اس مکان کو معلوم نہیں کس پاگل یا بے ڈھنگے شخص نے دقیانوس کے وقتوں میں بنایا تھا۔ میں آنکھیں بند کرلوں تو نہ صرف اس کے ڈھانچے کو اپنے سامنے مجسم دیکھتا ہوں بلکہ اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر محسوس کرنے لگتا ہوں۔ یہ اُن مکانوں میں سے ہے جو پرانے قلمدانوں پر بنی تصویروں ہی میں شاید ملیں۔

مجھے یہ سب کچھ لکھنا ہے تاکہ مجھے خود پر کوئی شک نہ رہے۔ مجھے دیوار پر پڑتے اپنے سائے پر سب کچھ واضح کرنا ہے۔ ہاں، پہلے میرے لیے ایک بہلاوا تھا، چھوٹا سا بہلاوا۔ میں کمرے کی چار دیواری میں بیٹھا قلمدانوں پر نقاشی کے مضحک کام میں مشغول رہتا تھا۔ لیکن جب میں نے اسے دیکھا، ان دو آنکھوں کو دیکھا، تو ہر جنبش اور ہر حرکت کا مفہوم اور قدر و قیمت میری نظر میں ختم ہوگئی۔ لیکن ایک عجیب اور یقین میں نہ آنے والی بات یہ ہے کہ نہ معلوم کیوں میری تمام نقاشی کا موضوع ایک جیسا اور ایک ہی شکل کا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ ایک سرو کا درخت بنایا کرتا تھا، جس کے نیچے ہندوستانی جوگیوں سے ملتا جلتا ایک خمیدہ پشت بوڑھا ایک لبادہ لپیٹے اور سر پر پگڑی باندھے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اس کے ہونٹوں پر ایک تعجب کی حالت میں رکھی ہوتی۔ اس کے روبرو ایک لڑکی لمبا سیاہ لباس پہنے، جھک کر اسے نیلوفر کا ایک پھول پیش کر رہی ہوتی تھی کیونکہ ان کے درمیان

ایک آبجو حائل تھی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ منظر میں نے پہلے کہیں دیکھ رکھا تھا یا مجھے خواب میں الہام کیا گیا تھا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ میں جو بھی نقش بناتا اس میں یہی منظر اور یہی موضوع ہوتا۔ میرے ہاتھ بلا ارادہ یہی تصور کرنے لگتے۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ میری ان تصویروں کو خریدار مل گئے تھے؛ یہاں تک کہ میں اپنے چچا کے توسط سے یہ قلمدان ہندوستان بھی بھیجتا تھا اور وہ انھیں فروخت کر کے ان کی رقم مجھے بھیج دیا کرتا تھا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں... شاید میں نے کہا کہ مجھے اپنی یادوں کو لکھ دینا چاہیے۔ لیکن یہ تو بہت بعد میں ہوا اور اس کا میری نقاشی کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں، اور اسی واقعے کے اثر سے میں نے نقاشی سے بالکل ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ دو ماہ... نہیں، دو ماہ اور چار روز پہلے کی بات ہے۔ نوروز کا تیرھواں دن تھا۔ سب لوگ جوق در جوق شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی بند کر دی تھی تاکہ نقاشی سے دھیان نہ بٹے۔ مغرب کے وقت میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ میرا چچا داخل ہوا۔ یعنی اس نے خود بتایا کہ وہ میرا چچا ہے۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ شروع جوانی ہی میں دور دراز علاقوں میں سفر کر گیا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید اسے تجارت کے سلسلے میں مجھ سے کچھ کام ہے، کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ تجارت بھی کرتا ہے۔ بہرحال، میرا چچا ایک خمیدہ پشت بوڑھا آدمی تھا۔ اس کے سر پر ایک ہندوستانی پگڑی بندھی ہوئی تھی اور اس نے زرد رنگ کی پھٹی پرانی سی عبا پہن رکھی تھی۔ سر اور چہرے کا کچھ حصہ گردن سے لپٹی شال نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کھلے گریبان میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ دکھائی دے رہا تھا۔ شال کے نیچے سے نکلی ہوئی چھدری ڈاڑھی کے بال الگ الگ گنے جا سکتے تھے۔ اس کے پپوٹے سرخ تھے اور اوپر کا ہونٹ بیچ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ایک دور دراز کی مضحکہ خیز شباہت رکھتا تھا، جیسے کسی بگڑے ہوئے آئینے میں دکھائی دینے والا عکس۔ میں نے اپنے باپ کا ہمیشہ اسی شکل میں تصور کیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں اس فکر میں پڑ گیا کہ اس کی تواضع کے لیے کوئی چیز مہیا کروں۔

میں نے چراغ جلایا اور اپنے کمرے کے برابر کی اندھیری کوٹھری میں گیا۔ میں نے اس کے ایک ایک کونے کو کریدا کہ اس کی تواضع کے لیے کوئی چیز مل سکے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ نہ افیون باقی تھی اور نہ شراب۔ اچانک میری نظر الماری کے سب سے اوپر والے خانے پر پڑی۔ گویا مجھ پر الہام ہوا۔ وہاں شرابِ کہنہ کی ایک بوتل رکھی تھی جو مجھے ورثے میں ملی تھی۔ میری پیدائش کے وقت اسے وہاں رکھ دیا گیا تھا۔ وہ سب سے اوپر والے خانے میں دھری تھی۔ مجھے اس کا کبھی خیال نہیں آیا اور میں بالکل بھولا ہوا تھا کہ ایسی بھی کوئی چیز گھر میں ہے۔ خانے تک پہنچنے کے لیے میں وہاں پڑی ایک چوپائی پر چڑھا لیکن بوتل کو اٹھاتے ہوئے میری نگاہ اچانک الماری کے ہوادان کے روزن سے باہر پڑی۔ میں نے دیکھا میرے کمرے کے پیچھے میدان میں ایک خمیدہ پشت بوڑھا شخص سرو کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور ایک نوجوان لڑکی — نہیں، ایک فرشتۂ آسمانی — اس کے روبرو جھک کر اسے دائیں ہاتھ سے نیلوفر کا ایک پھول پیش کر رہی تھی، جبکہ پیرمرد اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کا ناخن چبا رہا تھا۔

لڑکی کا رخ بالکل میرے سامنے تھا لیکن وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر نظر آتی تھی۔ وہ کسی چیز پر نظر جمائے بغیر سامنے دیکھ رہی تھی۔ ایک بے ارادہ مدہوش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کنارے پر خشک ہوگئی تھی جیسے وہ کسی غیر موجود شخص کے خیال میں کھوئی ہوئی ہو۔ اس وقت میں نے ان مہیب اور جادوگر آنکھوں کو دیکھا — ان تلخی سے سرزنش کرتی ہوئی، مضطرب، حیران اور دھمکاتی اور آس دلاتی ہوئی آنکھوں کو میں نے دیکھا، اور میری زندگی کی پرچھائیں ان چمکدار اور پُرمعنی آنکھوں میں کھنچ گئی اور ان کی تہہ میں جذب ہوگئی۔ اس مقناطیسی آئینے نے یوں میری تمام ہستی کو اپنی طرف کھینچ لیا کہ اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہرن کی سی ترکمانی آنکھیں جن میں فطرت سے ماورا ایک مست کر دینے والی چمک تھی، جو بیک وقت ڈراتی بھی تھیں اور خود میں جذب بھی کرتی تھیں۔ یوں تھا جیسے اس کی آنکھوں نے

ایسے ڈراؤنے اور ماورائے طبیعی مناظر دیکھے ہوں جو ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اٹھی ہوئی تھیں اور پیشانی بلند تھی۔ پتلی پتلی بھنویں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ یوں اَدھ کھلے تھے جیسے ابھی ابھی ایک طویل اور گرم بوسے کے بعد جدا ہوئے ہوں اور سیر نہ ہوئے ہوں۔ اس کے الجھے ہوئے بے ترتیب سیاہ بال اس کی مہتابی صورت کے گرد پھیلے ہوئے تھے اور ایک لٹ اس کی کنپٹی پر پڑی تھی۔ اس کے اعضا کی لطافت اور حرکات کی آسمانی بے اعتنائی حکایت کرتی تھی کہ وہ محض لمحاتی ہے۔ ایسی موزوں حرکات صرف کسی ہندوستانی مندر کی رقاصہ ہی کی ہو سکتی تھیں۔

اس کی اداس اور غم انگیز خوشی کی کیفیت بتاتی تھی کہ وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کا حسن معمولی نہیں تھا۔ وہ مجھے افیونی کے خواب کے کسی منظر کی طرح نظر آئی۔ اس نے مجھ میں سورج مکھی کی سی حرارت پیدا کی۔ اس کا نازک اور کشیدہ جسم شانوں، بازوؤں، پستانوں، کولھوں اور ٹانگوں سے یوں پیچھے کو کھنچا جا رہا تھا جیسے اسے اس کے جفت کی آغوش سے باہر کھینچ لیا گیا ہو۔ وہ مادہ سورج مکھی کی طرح لگتی تھی جسے اس کے نر سے کھینچ کر جدا کر دیا گیا تھا۔

اس نے سیاہ رنگ کا چنا ہوا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے جسم پر چست تھا اور منڈھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب میری نگاہ اس پر پڑی تو یوں لگا جیسے وہ اس آبجو کو پھلانگ جانا چاہتی ہو جو اس کے اور پیر مرد کے درمیان حائل تھی، لیکن وہ ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔ تب ہی بوڑھا آدمی زور سے ہنسا۔ وہ ایسی خشک اور کھوکھلی ہنسی تھی کہ آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں — ایک سخت، بہت دور سے آتی ہوئی تمسخر آمیز ہنسی جو اس کے جسم کے کہیں اندر سے گونج کر باہر نکل رہی ہو۔

میں شراب کی بوتل ہاتھ میں لیے، ہراساں ہو کر چوپائی سے نیچے کود پڑا۔ نہ جانے کیوں میں بری طرح لرز رہا تھا۔ مجھ پر وحشت اور کیف سے بھرپور لرزہ طاری تھا، جیسے میں کسی لذیذ اور ڈراؤنے خواب سے جاگ اٹھا ہوں۔ میں نے شراب کی بوتل فرش پر رکھی اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ نہ جانے کتنے لمحے یا کتنے گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے۔ جب

میں اپنے آپ میں آیا تو شراب کی بوتل لے کر کمرے میں واپس ہوا۔ میں نے دیکھا، میرا چچا جا چکا تھا اور کمرے کا دروازہ کسی مردے کے منھ کی طرح کھلا رہ گیا تھا۔ بوڑھے کی کھوکھلی ہنسی کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اندھیرا چھا رہا تھا۔ چراغ دھواں دینے لگا تھا۔ لیکن اس ڈراؤنے پُرکیف لرزے کا اثر مجھ پر باقی تھا۔ اس لمحے سے میری زندگی تبدیل ہو گئی۔ صرف ایک نگاہ اس بات کے لیے کافی تھی کہ وہ فرشتۂ آسمانی، وہ غیر زمینی دوشیزہ اس حد تک مجھ پر اپنا اثر چھوڑ دے جس کے ادراک سے انسان کی فہم عاجز ہے۔

اس وقت میں ایک بے خودی کے عالم میں تھا، یوں جیسے میں عرصے سے اس کے نام سے واقف ہوں۔ اس کی آنکھوں کا شرارہ، اس کا رنگ، اس کی خوشبو، اس کی حرکات، سب کچھ میری نگاہوں کو آشنا لگ رہا تھا جیسے اس زندگی سے پہلے کی زندگی میں، عالمِ مثال میں، میری اور اس کی روح ساتھ ساتھ رہتی بستی تھیں، ایک ہی اصل، ایک ہی مادے سے پھوٹی تھیں اور یہ طے تھا کہ انھیں پھر آپس میں مل جانا ہے۔ اس کی زندگی میں میرا اس کے قریب آنا ناگزیر تھا۔ میں نے کبھی اسے چھونے کی خواہش نہیں کی؛ صرف ہمارے جسموں سے پھوٹتی غیر مرئی شعاعوں کا ایک دوسرے میں گھل مل جانا کافی تھا۔ یہ وحشت انگیز واقعہ مجھے پہلی نظر میں آشنا لگا۔ کیا ہمیشہ دو محبت کرنے والوں کو یہی احساس نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایک دوسرے کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے اور ان کے بیچ ایک پراسرار تعلق رہ چکا ہے؟ اس پست دنیا میں میں یا تو اس کے عشق کا خواستگار تھا یا پھر کسی کے عشق کا نہیں... کیا یہ ممکن تھا کہ کوئی اور مجھ پر اتنا گہرا اثر چھوڑ سکے؟ لیکن اس بوڑھے کی خشک اور کھوکھلی ہنسی... اس منحوس ہنسی نے اس رابطے کو پارہ پارہ کر دیا جو ہمارے درمیان تھا۔

ساری رات میں یہی سوچتا رہا۔ کتنی ہی بار چاہا کہ جاؤں اور جا کر روزنِ دیوار سے باہر نگاہ ڈالوں، لیکن بوڑھے کی ہنسی کی آواز سے ڈر گیا۔ اگلے روز بھی اسی فکر میں رہا۔ کیا میں ایسا

کرسکتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے اس کے دیدار سے آنکھیں ڈھانپ لوں؟ آخر تیسرے روز میں نے شراب کی بوتل دوبارہ اسی جگہ پر رکھ دینے کا ارادہ کیا، لیکن جوں ہی میں نے الماری کا پردہ کھینچا تو سامنے ایک تاریک سیاہ دیوار تھی — بالکل اس اندھیرے کی طرح جو میری زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ وہاں کسی جھری یا ہوادان کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ وہ چوکور روزن اب بالکل بند تھا اور یوں دیوار کا حصہ بن چکا تھا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ میں نے چوپائی کو آگے کھینچ کر دیوار پر دیوانہ وار گھونسے مارے، کان لگا کر سنا، چراغ سامنے لا کر اسے اچھی طرح دیکھا لیکن اس روزن کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ دیوار پر میری کوششوں اور ضربوں کا کوئی اثر نہیں تھا جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی چٹان ہو۔ کیا میں دوبارہ اسے دیکھنے کی امید ہمیشہ کے لیے ترک کرسکتا تھا؟ یہ میرے بس سے باہر تھا۔ تب سے میں نے کتنا ہی انتظار کیا، کتنا ہی کریدا، کتنی ہی جستجو کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے اپنے گھر کے آس پاس کے چپے چپے کو چھان مارا۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں، بلکہ دو ماہ اور چار دن تک میں اپنے گناہ کی جگہ لوٹ لوٹ کر آنے والے خونیوں کی طرح، ایک سر کٹے مرغ کی تڑپ سے ہر شام اپنے گھر کے گرد گشت کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ میں اس علاقے کے ایک ایک پتھر اور کنکر کو پہچاننے لگا، لیکن سرو کے اس درخت، اس آبجو اور ان لوگوں کا کوئی نشان نہ پا سکا جنھیں میں وہاں دیکھ چکا تھا۔ ہر رات چاندنی میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں درختوں، پتھروں اور چاند کی منت سماجت کرتا کہ شاید وہ بھی اس وقت چاند کو دیکھ رہی ہو۔ میں نے تمام موجودات سے فریاد کی لیکن اس کا کچھ پتا نہ پایا۔ آخر میں جان گیا کہ یہ سب بے فائدہ ہے کیونکہ اس کی اس دنیا کی چیزوں سے کوئی وابستگی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً وہ جس پانی سے اپنے بال دھوتی ہے وہ کسی انجانے چشمے یا جادوئی غار سے نکلنے والا پانی ہوگا۔ اس کا لباس عام سوت اور اُون کے ریشوں سے نہیں بنا ہوگا اور اسے بنانے میں مادی، انسانی ہاتھوں کا کوئی دخل نہیں رہا ہوگا۔ وہ ایک انوکھی ہستی تھی۔ میں نے جانا کہ نیلوفر کے وہ پھول بھی معمولی پھول نہیں تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر وہ عام پانی اپنے چہرے پر ڈال

لے تو اس کا چہرہ پژمردہ ہو جائے، اور اپنی نازک لمبی انگلیوں سے عام نیلوفر کے پھول توڑ لے تو اس کی انگلیاں پھول کی پتیوں کی طرح کمھلا جائیں۔

میں یہ سب کچھ جان گیا۔ یہ دوشیزہ، نہیں یہ فرشتہ، میرے لیے حیرت اور ناگفتنی الہام کا سرچشمہ تھی۔ اس کی ہستی لطیف اور ہاتھ نہ آنے والی تھی۔ اس نے مجھ میں پرستش کی حس پیدا کر دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی غیر کی، کسی عام شخص کی ایک نگاہ اسے آلودہ اور پژمردہ کر دے گی۔

جب میں نے اسے کھو دیا، جس وقت ایک پتھریلی دیوار سیسے کی سی سنگینی کے ساتھ اس روزن کی جگہ میرے اور اس کے درمیان کھنچ گئی، تب مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی ہمیشہ کے لیے بے معنی اور گم ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے دیکھنے سے مجھے جو نوازش اور گہرا کیف محسوس ہوا وہ یک طرفہ تھا اور میں نے اس کا کوئی جواب نہ پایا، کیونکہ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا، لیکن ان آنکھوں کی مجھے ضرورت تھی اور اس کی صرف ایک نگاہ میرے لیے فلسفے اور الٰہیات کی ساری گتھیاں سلجھانے کو کافی تھی۔ اس کی صرف ایک نگاہ سے میرے لیے تمام رموز اور اسرار ختم ہو جاتے۔

اس کے بعد سے میں نے اپنی شراب اور افیون کی مقدار اور بڑھا دی۔ مگر افسوس، بجائے اس کے کہ یہ دارو میری ناامید سوچوں کو کند اور مفلوج کرے اور میں سب کچھ بھول سکوں، روز بروز، ساعت بہ ساعت، لمحہ بہ لمحہ اس کا خیال، اس کی صورت اور اس کا جسم اور زیادہ شدت سے میرے سامنے مجسم ہوتا گیا۔

میں کس طرح اسے فراموش کر سکتا تھا؟ چاہے میری آنکھیں کھلی ہوں یا بند، سوتے جاگتے ہر وقت وہ میرے سامنے رہتی تھی۔ کوٹھری کے روزن میں سے، جو آدمی کے فکر و منطق پر چھائی ہوئی رات کی طرح تاریک تھا، باہر کھلنے والے چوگوشہ سوراخ میں سے، وہ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہا کرتی تھی۔

آرام مجھ پر حرام ہو گیا۔ میں کیسے آرام کر سکتا تھا؟ غروب کے وقت مجھے باہر نکل کر گشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ میری خواہش اور ضد تھی کہ اس آبجو، اس سرو کے درخت اور اس بت کو تلاش کروں جس کے ہاتھ میں نیلوفر کا پھول تھا۔ جس طرح مجھے افیون کی عادت تھی، اسی طرح میں نے اس گشت کی بھی عادت ڈال لی۔ لگتا تھا کہ کوئی خارجی قوت مجھے اس پر مجبور کرتی ہے۔ سارے راستے میں اس کے خیال میں، اس اوّلیں دیدار کی یاد میں کھویا رہتا اور چاہتا تھا کہ اس مقام کو پالوں جہاں نوروز کی تیرھویں کو اسے دیکھا تھا۔ اگر وہ جگہ مل جاتی، اگر میں اس سرو کے نیچے بیٹھ پاتا تو میری زندگی کو سکون مل جاتا لیکن افسوس، سوائے خس و خاشاک، مردار جانوروں کی ہڈیوں اور کوڑے کرکٹ کو سونگھتے کتوں کے میں نے کچھ نہ پایا۔ کیا میں واقعی کبھی اس سے ملا تھا؟ کبھی نہیں — صرف چوری چھپے، کوٹھری کے بدبخت روزن سے اسے دیکھا تھا — گھورے کو سونگھتے اور کریدتے اس کتے کی مانند جو دور سے لوگوں کو کوڑے دان لاتا دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور بھاگ کر چھپ جاتا ہے، اور بعد میں لوٹ کر نئے کوڑے کرکٹ کو لذیذ بوٹیوں کی تلاش میں پھر کریدنے لگتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا، لیکن وہ روزن بند ہو چکا تھا۔ میرے لیے وہ تازہ پھولوں کا ایک دستہ تھی جسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا ہو۔

آخری رات، جب میں ہر رات کی طرح باہر نکلا، ہوا بند اور بارانی تھی اور ایک کثیف کہرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اس بارانی فضا میں، جو رنگوں کی شوخی اور چیزوں کے تیکھے خطوط کو ملائم کر رہی تھی، میں نے ذرا آزادی اور راحت محسوس کی اور مجھے یوں لگا جیسے بارش میرے تاریک خیالات کو دھو رہی ہو۔ اس رات وہ کچھ ہوا جسے نہیں ہونا تھا۔ میں بے ارادہ گھوم رہا تھا لیکن تنہائی کی ان ساعتوں میں، یا ان لمحوں میں جن کی مدت مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، اس کا پُرجلال چہرہ گویا کہرے کے پیچھے سے دھندلا دھندلا جھلکتا ہوا، ہمیشہ سے زیادہ صاف میری نظروں کے سامنے یوں ساکت اور بے حرکت مجسم ہو گیا جیسے قلمدان پر بنا ہوا نقش۔

جب میں واپس ہوا تو میرا گمان ہے کہ رات کافی گزر چکی تھی اور کہرا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا، یہاں تک کہ میں ایک قدم آگے بھی نہ دیکھ سکتا تھا لیکن اپنی عادت کی بنا پر اور اس خاص حس کی بنا پر جو مجھ میں بیدار ہو گئی تھی، میں اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش زنانہ شبیہ میرے گھر کے چبوترے پر بیٹھی ہے۔

میں نے تالا ڈھونڈنے کے لیے دیا سلائی جلائی لیکن نہ جانے کیوں میری نگاہ بے ارادہ اس سیاہ پوش شبیہ کی طرف اٹھ گئی اور میں نے اس نازک مہتابی چہرے پر ہرن کی سی بڑی بڑی دو سیاہ آنکھوں کو، ان آنکھوں کو پہچان لیا جو نگاہ کیے بغیر گھورتی رہتی تھیں۔ اگر میں نے اسے پہلے نہ دیکھا ہوتا تب بھی میں اسے پہچان لیتا۔ مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ یہ سیاہ پوش شبیہ وہی تھی۔ خواب کے اس عالم کی طرح جب انسان یہ جانتا ہے کہ خواب دیکھ رہا ہے اور جاگ اٹھنا چاہتا ہے لیکن نہیں اٹھ پاتا، میں بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ میں گویا اپنی جگہ پر خشک ہو گیا تھا۔ تیلی آخر تک جل گئی اور میری انگلیاں جلنے لگیں، تب میں ایک دم اپنے آپ میں آیا اور بڑھ کر تالا کھولا۔ دروازہ کھول کر میں ایک طرف کو ہو گیا۔ وہ راستے سے واقف کسی شخص کی طرح چبوترے سے اٹھی اور اندھیرے دالان سے گزر کر میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے جلدی سے چراغ روشن کیا اور دیکھا تو وہ میرے کمرے سے گزر کر کونے میں میرے پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا، نہ جانے وہ مجھے دیکھ رہی تھی یا نہیں، میری آواز سن سکتی تھی یا نہیں۔ بظاہر نہ وہ خوف کی حالت تھی اور نہ مزاحمت کی۔ یوں تھا جیسے بے ارادہ وہاں چلی آئی ہو۔

کیا وہ بیمار تھی، یا راستہ بھول گئی تھی؟ وہ نیند میں چلنے والے شخص کی طرح بے ارادہ وہاں آ پہنچی تھی۔ اس ایک لمحے میں میں جس کیفیت سے گزرا اس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک گوارا اور ناقابلِ بیان اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ نہیں، مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ یہ وہی عورت، وہی دوشیزہ تھی جو بلا تعجب، ایک لفظ بولے بغیر، میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ میں نے ہمیشہ

اس سے پہلی ملاقات کا اسی طرح تصور کیا تھا۔ یہ کیفیت میرے لیے ایک گہری اور ختم نہ ہونے والی نیند کی طرح تھی کیونکہ اس طرح کا خواب دیکھنے کے لیے بہت گہری نیند میں ہونا ضروری تھا۔ یہ سکوت میرے لیے ایک ختم نہ ہونے والی زندگی کی طرح تھا کیونکہ ازل اور ابد کی حالت میں کوئی بول نہیں سکتا۔

میرے لیے وہ بیک وقت ایک عورت بھی تھی اور خود میں انسانوں سے ماورا کوئی چیز بھی رکھتی تھی۔ اس کی صورت دیکھنے سے مجھ میں ایک ایسی چکرا دینے والی فراموشی پیدا ہوگئی جس نے باقی تمام انسانوں کے چہرے محو کر دیے، اس طرح کہ اس کے دیکھنے سے مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا اور میری ٹانگیں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ اس ایک لمحے میں میں نے اپنی پوری زندگی کی ساری دردناک سرگذشت اس کی ان گہری، بے اندازہ گہری آنکھوں میں دیکھ لی۔ اس کی بھیگی ہوئی چمکدار آنکھیں جیسے اشکوں میں تر دو الماس، اس کی سیاہ آنکھوں میں میں نے اس ناگذار اندھیرے کی بے انت رات کو پالیا جس کی مجھے جستجو تھی اور میں اس مہیب اور افسوں گر تاریکی میں ڈوب گیا۔ یوں تھا جیسے وہ میرے اندر سے کسی طاقت کو کھینچ کر باہر نکال رہی ہو۔ میرے پیروں تلے کی زمین لرز رہی تھی اور اگر میں زمین پر گر پڑتا تو ناقابلِ بیان کیف محسوس کرتا۔

میرا دل ٹھہر گیا۔ میں نے سانس روک لیا۔ مجھے خوف تھا کہ اِدھر میں نے سانس لیا اُدھر وہ بادل یا دھویں کی طرح غائب ہو جائے گی۔ اس کی خاموشی جادو تھی کہ ہمارے درمیان ایک بلوریں دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ وہ لمحہ، وہ ساعت یا وہ لازمانیت میرا دم گھونٹے دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں تھک کر آہستہ آہستہ مندنے لگیں جیسے انھوں نے کسی ایسی ماورائے طبیعی چیز کو دیکھ لیا ہو جسے ہر کوئی دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا، جیسے انھوں نے موت کو دیکھ لیا ہو۔ اس کی پلکیں بند ہوگئیں اور میں ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح جو جان توڑ کوشش سے سطح پر آیا ہو، بخار کی شدت سے لرزنے لگا۔ میں نے آستین کے کنارے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔

اس کا چہرہ اسی سکون اور بے حرکتی کی کیفیت میں تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ اور زیادہ کمزور

اور لاغر ہو گئی ہے۔ اسی طرح لیٹے لیٹے وہ اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کا ناخن چبا رہی تھی۔ اس کا چہرہ مہتابی ہو رہا تھا اور باریک سیاہ لباس میں سے جو اس کے بدن پر چست تھا، پنڈلیوں، بازوؤں اور پستانوں کے خطوط ظاہر ہو رہے تھے۔

میں اسے اچھی طرح دیکھنے کے لیے جھکا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اگرچہ میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھ سے بے حد دور معلوم ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس کے دل کے بھیدوں کی ذرا بھی خبر نہیں اور ہمارے درمیان کوئی رابطہ وجود نہیں رکھتا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں اس کے کان، اس کے حساس کان جو ضرور دور سے آتی ہوئی ملائم آسمانی موسیقی سننے کے عادی ہوں گے، میری آواز سے متنفر نہ ہو جائیں۔

مجھے خیال آیا کہ شاید اسے بھوک پیاس لگی ہو۔ میں کوٹھری میں گیا کہ اس کے لیے کوئی چیز مہیا کروں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن اچانک گویا مجھ پر الہام ہوا کہ الماری کے اوپر شرابِ کہنہ کی ایک بوتل رکھی ہے جو مجھے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ میں نے چوپائی پر چڑھ کر شراب کی بوتل اتاری۔ دبے پاؤں پلنگ کے پاس گیا۔ دیکھا وہ کسی تھکے ماندے بچے کی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بالکل بے سدھ تھی اور اس کی لمبی مخملیں پلکیں بند تھیں۔ میں نے بوتل کھولی اور ایک پیالہ شراب بھینچے ہوئے دانتوں میں سے اس کے حلق میں ڈال دی۔

زندگی میں پہلی بار مجھے تسکین کا احساس ہوا۔ میں اس کی بند آنکھوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ آسیب جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا، وہ کابوس جو اپنے آہنی پنجوں سے مجھے بھینچ رہا تھا، کچھ دیر کے لیے سو گیا ہو۔ میں نے اپنی کرسی پلنگ کے پاس کھینچ لی اور اس کے چہرے کو خیرہ ہو کر دیکھنے لگا۔ کیا بچوں کی سی صورت تھی اور کیا عجیب کیفیت۔ کیا یہ ممکن تھا کہ یہ عورت، یہ دوشیزہ، یا فرشتۂ عذاب (کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا نام دوں) ایسا دوہرا وجود رکھتی ہو؟ اس قدر پرسکون، اس قدر بے تکلف؟

اب میں اس کے جسم کی گرمی اور اس کے سیاہ پتھریلے بالوں سے اٹھتی نمناک مہک کو محسوس کر سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بلند کیا — کیونکہ میرا ہاتھ میرے اختیار میں نہ تھا — اور کنپٹی پر گری اس کے بالوں کی لٹ پر رکھ دیا۔ پھر میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے بال نمناک اور سرد تھے۔ سرد — بالکل سرد، جیسے اسے مرے ہوئے کئی روز گزر گئے ہوں۔ یہ میرا اشک نہیں تھا، وہ واقعی مر چکی تھی۔ میں نے اس کے لباس میں ہاتھ ڈال کر اس کے بائیں پستان پر رکھا۔ مجھے ذرا بھی گرمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں آئینہ اٹھا لایا اور اس کی ناک کے سامنے رکھا لیکن اس میں زندگی کا کوئی نشان نہ پایا۔

میں نے چاہا کہ اپنے جسم کی حرارت سے اسے گرماؤں۔ اپنی گرمی اسے دے دوں اور موت کی سردی اس سے لے لوں کہ شاید اسی وسیلے سے اپنی روح اس کے تن میں داخل کر سکوں۔ میں لباس اتار کر پلنگ پر اس کے برابر لیٹ گیا۔ ہم ایک دوسرے سے یوں لپٹے ہوئے تھے جیسے سورج مکھی کے نر اور مادہ پودے ہوں۔ درحقیقت اس کا تن مادہ سورج مکھی کا جسم تھا جسے اس کے نر سے الگ کر دیا گیا تھا، اور اس میں اسی عشق کی جلن تھی۔ اس کا دہن کڑوا اور تلخ تھا اور اس کا ذائقہ لکڑی کے ڈنٹھل کا سا تھا۔ اس کا سارا بدن اولے کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی شریانوں میں خون جمتا محسوس ہوا اور یوں لگا جیسے یہ ٹھنڈک میرے دل کی تہہ تک اتر گئی ہو۔ میں پلنگ سے اتر آیا اور کپڑے پہن لیے۔ نہیں، یہ جھوٹ نہیں تھا، اس نے یہیں اسی کمرے میں، میرے پلنگ پر اپنا جسم مجھے سونپا تھا، اپنا جسم اور اپنی روح دونوں میرے سپرد کر دیے تھے۔

جب تک وہ زندہ تھی، جب تک اس کی آنکھیں زندگی سے سرشار تھیں، صرف ان آنکھوں کی یاد نے مجھے جکڑے رکھا لیکن اب اس نے آکر بند، بے حس و حرکت اور سرد آنکھوں کے ساتھ اپنا آپ مجھے سونپ دیا تھا — بند آنکھوں کے ساتھ۔

یہ وہی تھی جس نے میری زندگی کو زہر آلود کر دیا تھا، یا شاید میری زندگی کی تقدیر ہی میں

زہر آلود ہونا لکھا تھا اور اس کے بغیر میرا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اب اس نے یہاں میرے کمرے میں اپنا جسم اور اپنی روح مجھے سونپ دی۔ اس کی نازک اور ناپائیدار روح، جس کا زمین پر بسنے والوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا، آہستہ آہستہ اس کے پھٹے ہوئے سیاہ لباس میں سے باہر آئی، اس جسم سے باہر آئی جس نے اسے قید کر رکھا تھا، اور بھٹکے ہوئے سایوں کی دنیا میں چلی گئی۔ لگتا تھا وہ میرے سائے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی لیکن اس کا جسم بے حس و حرکت وہاں پڑا رہ گیا تھا۔ اس کے نرم اور ملائم عضلات، اس کی نسیں اور ہڈیاں گل جانے کے انتظار میں تھیں اور زمین کے اندر کے کیڑوں اور چوہوں کے لیے لذیذ خوراک مہیا تھی۔ رنج اور افلاس سے بھرے اس فقیرانہ کمرے میں، اس قبر جیسے کمرے میں، اس تاریکی میں جس نے مجھے گھیر رکھا تھا اور دیواروں میں جم گئی تھی، مجھے ایک لمبی، تاریک، سرد اور نہ ختم ہونے والی رات ایک لاش کے پاس گزارنی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جب سے یہ دنیا بنائی گئی ہے، جب سے میرا وجود ہے، ایک لاش، ایک سرد اور بے حرکت لاش اس اندھیرے میں میرے ساتھ رہتی آئی ہے۔

میرے خیالات اس لمحے میں منجمد ہو گئے تھے۔ ایک عجیب و غریب وجود نے میرے اندر جنم لیا تھا کیونکہ میری زندگی ان سب ہستیوں سے مربوط ہو گئی تھی جو میرے اردگرد تھیں، ان تمام سایوں سے جو میرے اطراف لرزاں تھے اور دنیا سے اور فطرت اور موجودات سے ایک گہری اور انمٹ وابستگی پیدا ہو گئی تھی اور غیر مرئی رشتوں کے وسیلے سے ایک بے چین بہاؤ میرے اور عناصرِ فطرت کے درمیان قائم ہو گیا تھا۔ کوئی فکر، کوئی خیال مجھے غیر فطری معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں نقاشی کے قدیم رموز اور فلسفے کی ادق کتابوں کے اسرار اور اشکال و انواع کی ازلی حماقت کو سمجھنے پر قادر تھا، کیونکہ اس لمحے میں میں زمین اور افلاک کی گردش، پودوں کی اُگن اور حیوانوں کی جنبش میں شریک تھا۔ گزشتہ و آئندہ، دور و نزدیک میرے احساس میں شریک اور گم ہو گئے تھے۔

ایسے موقعوں پر ہر کوئی اپنی زندگی کی کسی پختہ عادت میں یا اپنے کسی وہم میں پناہ لیتا ہے — شرابی شراب میں مست ہو جاتا ہے، لکھنے والا لکھنے میں، سنگ تراش، سنگ تراشی میں — اور ہر ایک اس بے چینی اور الجھن کو اپنے اپنے محرک کے وسیلے سے زندگی سے خارج کرتا ہے؛ اور یہی موقعے ہوتے ہیں جب ایک سچا فنکار اپنے شاہکار کو وجود میں لا سکتا ہے۔ لیکن میں، بے ذوق اور بے بس، محض قلمدان کے ڈھکنوں کا نقاش — میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ ان معمولی، بھڑک دار اور بے روح تصویروں میں سے، جو سب ایک ہی شکل کی تھیں، میں کون سی تصویر بناتا کہ شاہکار ہوتی؟ پھر بھی مجھے اپنے تمام وجود میں ایک سرشاری اور حرارت محسوس ہو رہی تھی، ایک خاص طرح کا جوش اور ہلچل۔ میں چاہتا تھا کہ ان آنکھوں کو جو اب ہمیشہ کے واسطے بند ہو گئی تھیں، کاغذ پر اُتار کر اپنے پاس رکھ لوں۔ اس احساس نے مجھے اپنے خیال کو عمل کی صورت دینے پر اکسایا۔ مجھ میں ایک عجیب طرح کی زندگی پیدا ہو گئی۔ اس وقت جب میں ایک لاش کے ساتھ محبوس تھا، اس خیال نے مجھ میں عجب نشاط پیدا کیا۔

آخر میں نے دھواں دیتے چراغ کو گل کیا اور دو شمع دان لا کر اس کے سرہانے روشن کر دیے۔ شمع کی لرزتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ اور پر سکون ہو گیا تھا اور کمرے کی دھندلی روشنی میں وہ ایک پر اسرار اور آسمانی کیفیت میں لگ رہی تھی۔ میں کاغذ اور نقاشی کا سامان لے کر اس کے پلنگ کے پاس آیا۔ ہاں، یہ پلنگ اب اُس کا تھا۔ یہ صورت جسے آہستہ آہستہ گل کر نابود ہو جانا تھا، اور جو اس وقت بے حرکتی اور ٹھہراؤ کی کیفیت میں تھی، میں اس کے خطوط کو بہت آرام سے کاغذ پر اتار لینا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی صورت کے وہ خطوط چنوں جنھوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میری نقاشی چاہے سادہ اور مختصر ہو لیکن موثر ہو اور روح رکھتی ہو۔ میں اب تک قلمدانوں پر محض عادت کی بنا پر ایک سی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ اب اپنی فکر کو کام میں لا کر مجھے اپنے خیال کو یعنی اس واہمے کو مجسم کرنا تھا، جس نے اس کی صورت سے اٹھ کر مجھ پر اثر کیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر مجھے آنکھیں بند کر لینی تھیں اور اس کے منتخب نقوش کو کاغذ پر

لانا تھا کہ اپنے ذہن کے وسیلے سے اپنی جکڑی ہوئی روح کے لیے تریاق پیدا کر سکوں۔ آخر کار میں نے بے حرکت خطوط واشکال کی دنیا میں پناہ لی...

روے مردہ کی نقاشی — یہ موضوع میری مردہ نقاشی سے خاص مناسبت رکھتا تھا۔ اصل میں میں لاشوں ہی کا نقاش تھا۔ لیکن کیا اس کی آنکھوں کو، بند آنکھوں کو دوبارہ دیکھنا ضروری تھا؟ کیا وہ ابھی تک میرے ذہن اور فکر میں کافی مجسم نہیں ہوئی تھیں؟

میں نہیں جانتا صبح تک کتنی بار میں نے اس کی تصویر بنائی لیکن کوئی بھی میرے جی کو نہ لگی۔ جو بھی تصویر بنائی، پھاڑ ڈالی۔ اس کام میں مجھے تھکن کا احساس ہوا اور نہ وقت کے گزرنے کا۔

اندھیرا اچھٹ رہا تھا۔ ایک گدلی سی روشنی کھڑکی کے شیشے میں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں جو تصویر بنانے میں منہمک تھا وہ مجھے پچھلی تمام تصویروں سے بہتر لگ رہی تھی۔ لیکن آنکھیں؟ وہ کسی ناقابل معافی گناہ پر سرزنش کرتی ہوئی آنکھیں میں کاغذ پر نہ اتار سکا۔ میرے ذہن سے ان آنکھوں کا وجود اور ان کی یاد بالکل مٹ چکی تھی۔ میری کوشش بیکار تھی۔ کتنا ہی اس کے چہرے پر نگاہ جماتا، ان آنکھوں کی کیفیت ذہن میں نہ آتی تھی۔ اچانک اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی آئی اور ہوتے ہوتے ان کا رنگ قصاب کی دکان پر لٹکے ہوے گوشت کا سا ہو گیا۔ اس میں پھر سے جان پڑ رہی تھی۔ اس کی بے اندازہ گہری اور حیران آنکھیں جن میں زندگی کا تمام تر فروغ جمع ہو گیا تھا اور جو بیماری کی دھیمی روشنی سے چمک رہی تھیں، وہ سرزنش کرتی ہوئی آنکھیں بہت آہستہ آہستہ کھلیں اور میرے چہرے کی طرف اٹھیں — پہلی بار اس نے میری طرف توجہ کی، مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر اس کی آنکھیں مند گئیں۔ اس بات میں شاید ایک لمحے سے زیادہ نہیں لگا ہوگا، لیکن یہ عرصہ میرے لیے اس کی آنکھوں کی کیفیت پانے کو کافی تھا تاکہ میں اس کیفیت کو کاغذ پر اتار سکوں۔ میں نے موقلم سے اس کیفیت کو کاغذ پر نقش کیا اور اب کے میں نے تصویر کو نہیں پھاڑا۔

تب میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ اس کے نزدیک گیا۔ وہ میرے تصور میں زندہ تھی، پھر سے جی اٹھی تھی، میرے عشق نے اس کے جسم میں روح پھونک دی تھی، لیکن جب میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے لاش کی بو محسوس ہوئی، ایک گلتی ہوئی لاش کی۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے کیڑے چل پھر رہے تھے اور شہد کی دو مکھیاں شمع کی روشنی میں اس کے اوپر اُڑ رہی تھیں۔ وہ بالکل بے جان تھی۔ لیکن پھر اس کی آنکھیں کس طرح کھلیں؟ کیا یہ میں نے خواب دیکھا تھا، یا حقیقت تھی؟

میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے یہ سوال کرے۔ لیکن اصل چیز اس کی صورت تھی، نہیں، بلکہ اس کی آنکھیں، اور وہ اب میرے پاس تھیں۔ اس کی آنکھوں کی روح کاغذ پر اب میرے پاس موجود تھی۔ اس کے باقی جسم کی اب مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی، اس جسم کی جس کا مقدر نابود ہونا اور زمین کے کیڑوں اور چوہوں کی خوراک بننا تھا۔ اب سے بعد وہ میرے بس میں تھی۔ میں اس کی مخلوق نہ تھا۔ میں جب چاہتا اس کی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ہر ممکن احتیاط سے اپنی بنائی تصویر کو اٹھایا، اسے ایک دھات کی صندوقچی میں رکھا جو میری تجوری تھی اور اسے کوٹھری کی الماری میں چھپا کر رکھ دیا۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے تھک گئی ہو۔ نہایت مدھم آوازیں بہت دور سے کان میں آتی تھیں، جیسے نیند میں کسی پرندے کے اُڑنے کی یا سبزے کے اُگنے کی آواز۔ پھیکے ستارے اس وقت بادلوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ صبح کا دھیما سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا۔ تب ہی کہیں دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔

اس کی لاش کا کیا کروں؟ اس لاش کا جو اَب گلنے لگی تھی۔ پہلے سوچا کہ اسے اپنے کمرے ہی میں دفن کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ اسے باہر لے جا کر اس کنویں میں ڈال دوں جس کے گرد نیلوفر کے پھول اُگے ہوئے تھے۔ لیکن کسی کی نظروں سے بچ کر یہ سب کرنے کے لیے کتنی ذہانت، کتنی مشقت اور کتنی چابک دستی کی ضرورت تھی۔ پھر میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی

غیر نگاہ اس پر پڑے، سو یہ سارا کام مجھے تنہائی میں خود اپنے ہاتھوں سے انجام دینا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی — اس کے بعد میرے جینے کا کیا فائدہ تھا؟ لیکن معمولی انسانوں میں کسی اور کی نظر اس کی لاش پر نہیں پڑنی چاہیے۔ اسی لیے اس نے میرے کمرے میں آ کر اپنا سرد جسم اور اپنی روح مجھے سونپی تھی کہ کوئی اور اسے نہ دیکھے، وہ کسی اور کی نگاہ سے آلودہ نہ ہو۔ آخر مجھے ایک خیال آیا — اگر اس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور اپنے پرانے صندوق میں رکھ کر اسے انسانی نگاہوں سے دور، بہت دور لے جا کر دفن کر آؤں؟

اس بار میں بالکل نہیں ہچکچایا۔ ہڈی کے دستے والا چاقو، جو کوٹھری میں رکھا تھا، لے آیا اور سب سے پہلے بہت دقت سے اس کا نازک سیاہ لباس کاٹا جس نے مکڑی کے جالے کی طرح اسے قید کر رکھا تھا۔ اس کے بدن پر اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لگتا تھا وہ لمبے قد کی تھی کیونکہ وہ معمول سے زیادہ لمبی نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے اس کا سر الگ کیا۔ اس کے گلے سے جمے ہوئے خون کے لوتھڑے نکلنے لگے۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں قطع کیے اور سارے جسم کے اعضا کو ترتیب سے صندوق میں جمایا اور اس کا سیاہ لباس اس پر کھینچ دیا۔ اس کے بعد میں نے صندوق کو تالا لگا کر چابی جیب میں رکھ لی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ جب میں نے صندوق کو ہلا کر وزن کا اندازہ کیا تو وہ خاصا بھاری تھا۔ اتنی تھکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نہیں، میں اکیلے اس صندوق کو اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔

بادل چھا گئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش پھر ہونے لگی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکلا کہ کسی شخص کو تلاش کروں جو میرے ساتھ یہ صندوق اٹھوا سکے۔ آس پاس کوئی جاندار دکھائی نہ دے رہا تھا۔ میں بڑی دشواری سے تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ کہرے میں ایک خمیدہ پشت بوڑھے کو دیکھا جو سرو کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ، جو گردن کے گرد لپٹی شال میں چھپا ہوا تھا، نظر نہ آیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔ ابھی میں ایک لفظ بھی کہنے نہ پایا تھا

کہ بوڑھا خشک اور کھرکھراتی آواز میں زور زور سے ہنسنے لگا، رونگٹے کھڑے کردینے والی ہنسی۔ پھر وہ بولا:

''... اگر تمھیں مزدور چاہیے تو میں حاضر ہوں۔ میرے پاس لاشیں لے جانے والی گاڑی بھی ہے۔ میں ہر روز لاشیں شاہ عبدالعظیم لے جاکر دفن کرتا ہوں۔ میں تابوت بھی بناتا ہوں، ہر ایک کے قد کے مطابق، بال برابر فرق نہ ہوگا۔ میں حاضر ہوں، ہر وقت...''

اس نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ اس کے کندھے لرزنے لگے۔ میں نے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا لیکن اس نے مجھے ایک بھی لفظ بولنے کی مہلت نہ دی، اور بولا:

''... اس کی ضرورت نہیں۔ میں تمھارا گھر جانتا ہوں۔ بس ابھی پہنچا...''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اپنے گھر کی طرف چلا اور کمرے میں سے لاش کا صندوق گھسیٹ کر دروازے تک لے آیا۔ دیکھا تو لاشیں اٹھانے والا ایک بے حد پرانا اور شکستہ ریڑھا دروازے پر کھڑا تھا اور سیاہ رنگ کے دو کمزور گھوڑے اس میں جتے ہوئے تھے۔ خمیدہ پشت بوڑھا اوپر کوچوان کی گدی پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا چابک تھا۔ اس نے مڑ کر مجھ پر نگاہ نہیں ڈالی۔ میں نے بڑی دقت سے صندوق کو گاڑی میں رکھا جہاں تابوت کے لیے خاص جگہ بنی ہوئی تھی۔ پھر میں بھی اوپر چڑھ گیا اور تابوت والی جگہ میں لیٹ گیا اور اپنا سر گاڑی کی لگر کی طرف رکھا تاکہ آس پاس دیکھ سکوں۔ پھر میں نے صندوق کو گھسیٹ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔

چابک ہوا میں سنسنایا اور گھوڑے زور زور سے ہانپتے ہوئے چل دیے۔ ان کی ناکوں سے نکلتی ہوئی بھاپ کہرے میں دھویں کے بخارات جیسی دکھائی دے رہی تھی اور ان کے قدم اونچے اور ہموار اٹھ رہے تھے۔ کسی چور کی طرح، جس کی انگلیاں قانون کی رو سے کاٹ دی گئی ہوں اور کھولتے ہوئے تیل سے جلا دی گئی ہوں، ان کی لاغر ٹانگیں زمین پر تیز اور بے صدا پڑ رہی تھیں۔ ان کی گردنوں کی گھنٹیاں ابر آلود فضا میں ایک خاص طرح کا ترنم پیدا کر رہی تھیں۔

ایک بے وجہ اور ناگفتنی طمانیت مجھ پر سر سے پاؤں تک طاری تھی، یہاں تک کہ مجھے گھوڑا گاڑی کی حرکت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی — صرف اپنی پسلیوں پر صندوق کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اس لاش کا بوجھ میں نے ہمیشہ سے اپنے سینے پر لے رکھا ہے۔ راستے میں ہر طرف سخت کہرا چھایا ہوا تھا۔ گاڑی تیزی اور ہمواری سے پہاڑیوں، میدانوں اور ندی نالوں پر سے گزر رہی تھی۔ میرے اردگرد ایک ایسا نیا اور بے مثل منظر تھا جو میں نے اس سے پہلے خواب یا بیداری میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ راستے کے دونوں جانب دور دور تک پہاڑیوں اور عجیب وغریب ٹیڑھے میڑھے اور نفرت انگیز درختوں کا سلسلہ تھا اور ان کے اس طرف خاکستری رنگ کے تکونے، مکعب اور منشور شکلوں کے مکان اور ان کی چھوٹی چھوٹی، بغیر شیشوں کی اندھیری کھڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ کھڑکیاں ہذیانی بخار کے کسی چکرائے ہوئے مریض کی آنکھوں کی طرح تھیں۔ نہ جانے ان دیواروں میں کیا تھا کہ آدمی کے دل تک ان کی سردی اور برودت پہنچتی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی جاندار وجود ان مکانوں کو اپنا مسکن نہیں بنا سکتا۔ شاید آسمانی موجودات کی روحوں کے لیے یہ مکان مناسب تھے۔

کوچوان مجھے شاید کسی مخصوص راستے سے، یا بغیر کسی خاص راستے کے، لیے جا رہا تھا۔ بعض جگہ صرف کٹے ہوئے تنے اور ٹیڑھے میڑھے درخت راستے کے دونوں طرف چھا جاتے اور ان کے پیچھے اقلیدس کی مختلف شکلوں کے مخروطی، نیم مخروطی، اونچے نیچے مکان دکھائی دیتے۔ ان کی کھڑکیاں تنگ اور ٹیڑھی تھیں جن میں سے نیلوفر کی بیلیں اندر گھس گئی تھیں اور در و دیوار کو گھیر لیا تھا۔ یکایک یہ منظر کثیف کہرے میں گم ہو گیا۔ بڑے بڑے بادلوں نے پہاڑیوں کی چوٹیوں کو ڈھانپ رکھا تھا اور گرتی ہوئی ننھی ننھی بوندیں ہوا میں گرد وغبار کی طرح تیر رہی تھیں۔ بہت دیر چلتے رہنے کے بعد گاڑی ایک اونچے بے آب وگیاہ پہاڑ کے پاس ٹھہر گئی۔ میں نے صندوق اپنے سینے پر سے ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

پہاڑ کے پیچھے ایک سنسان، پرسکون اور صاف ستھرا احاطہ تھا۔ یہ جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ میں اسے پہچانتا تھا؛ پھر بھی یہ مجھے جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی جیسے یہ میرے تصور سے باہر کی چیز نہیں تھی۔ نیلوفر کے نیلے بے بو پھولوں کی بیلوں سے زمین ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ آج تک کسی شخص نے اس جگہ قدم نہیں رکھا ہے۔ میں نے صندوق کو زمین پر اتارا۔ بوڑھے کوچوان نے گردن پھیر کر کہا:

''یہ جگہ شاہ عبدالعظیم کے قریب ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں۔ یہاں پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔''

میں نے کوچوان کو کرایہ ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب میں صرف دو قران اور ایک عباسی کے سکے تھے۔ کوچوان خشک کھرکھراتی آواز میں ہنسا اور بولا:

''... ٹھیک ہے ٹھیک ہے، بعد میں لے لوں گا، تمھارا گھر جانتا ہوں... مجھ سے اور کوئی کام تو نہیں؟ تمھیں بتاتا ہوں کہ میں قبریں کھودنے کا کام بھی کر لیتا ہوں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ یہاں قریب ہی سرو کے درخت کے پاس نہر ہے۔ میں اس کے کنارے پر اس صندوق کے ناپ کا گڑھا کھود دیتا ہوں، اور جاتا ہوں...''

بوڑھا ایسی پھرتی سے اپنی گدی پر سے کودا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صندوق اٹھایا اور ہم دونوں ایک سوکھی ہوئی ندی کے پہلو میں ایک درخت کے تنے کے پاس پہنچے۔ اس نے کہا:

''یہ جگہ ٹھیک ہے؟''

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کدال اور بیلچے سے، جو وہ ساتھ لایا تھا، زمین کھودنے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے صندوق زمین پر رکھ دیا اور اپنی جگہ پر ہکا بکا کھڑا رہا۔ بوڑھا جھک کر مہارت اور پھرتی سے زمین کھودتا رہا۔ کھدائی کے دوران میں اس نے زمین سے چمکدار کوزے جیسی کوئی چیز نکالی، اسے اپنے گندے رومال میں لپیٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا:

''یہ رہی قبر۔ بالکل صندوق کے ناپ کی۔ بال برابر فرق نہیں!''

میں نے اس کی مزدوری ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں دو قران اور ایک عباسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بوڑھا خشک اور بھیانک آواز میں ہنستے ہوئے بولا:

''اس کی فکر مت کرو، رہنے دو۔ میں تمھارا گھر جانتا ہوں... پھر مجھے مزدوری کی جگہ یہ کوزہ مل گیا ہے۔ یہ راغہ کا گلدان ہے، رے کے قدیم شہر کا!''

اس کے بعد وہ جھک کر ہنسنے لگا اور اس کے کندھے لرزنے لگے۔ کوزے کو اس نے گندے رومال میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور لاش گاڑی کے پاس جا کر اسی مخصوص پھرتی سے اپنی گدی پر چڑھ گیا۔ چابک ہوا میں سنسنایا، گھوڑے زور زور سے ہانپتے ہوئے چل دیے، ان کی گردنوں میں پڑی گھنٹیاں ابر آلود فضا میں ایک خاص طرح کا ترنم پیدا کرنے لگیں اور رفتہ رفتہ گاڑی کہرے میں غائب ہوگئی۔

اکیلے رہ جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا۔ گویا ایک بھاری بوجھ میرے سینے سے اتر گیا اور سر سے پیر تک اس کی تسکین مجھ پر چھا گئی۔ میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ نیلی پہاڑیوں اور ٹیلوں سے گھرا یہ ایک چھوٹا سا احاطہ تھا۔ ایک طرف پہاڑوں میں پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی بنی قدیم عمارتوں کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یہ جگہ سنسان، دور اُفتادہ اور بے سروصدا تھی۔ میں دل کی گہرائیوں سے خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ گہری آنکھیں جب خوابِ زمینی سے بیدار ہوں گی تو اپنے چہرے اور اپنی کایا کے لائق ایک جگہ پائیں گی؛ اور یہ بھی کہ اس کے شایاں تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی دوسروں سے، دوسرے مرے ہوؤں سے دور دفن ہو، جس طرح زندگی میں وہ دوسرے زندوں سے الگ تھلگ رہی تھی۔

میں نے صندوق کو احتیاط سے اٹھا کر گڑھے میں رکھا۔ گڑھا بالکل اس کے ناپ کا تھا، بال برابر بھی فرق نہ تھا۔ میرا جی چاہا کہ آخری بار صندوق کھول کر اسے دیکھ لوں۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا، کوئی جاندار دکھائی نہ دیا۔ میں نے جیب سے چابی نکالی اور صندوق کھولا،

لیکن جب میں نے سیاہ لباس کا کونا ہٹایا تو جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں اور رینگتے ہوئے کیڑوں کے درمیان دو گہری سیاہ آنکھیں، پلک جھپکائے بغیر، نگاہ جمائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری زندگی ان آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ میں نے جلدی سے صندوق کا ڈھکنا بند کیا اور اسے مٹی سے ڈھانپ دیا۔ پھر اس کے اوپر اور مٹی ڈال کر اسے اچھی طرح کوٹ کر پختہ کر دیا۔ اس کے بعد میں جا کر بے بونیلوفر کی بیلیں لے آیا اور انھیں اس مٹی پر پھیلا دیا۔ اس کے اوپر میں نے کنکر پتھر اکٹھے کر کے بکھیر دیے تا کہ قبر بالکل چھپ جائے اور کوئی اسے شناخت نہ کر سکے۔ یہ سب کام میں نے اس قدر خوبی سے انجام دیا تھا کہ خود میرے لیے باقی زمین سے اس کی قبر کو جدا شناخت کرنا مشکل تھا۔

کام ختم کر کے میں نے خود پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ میرے کپڑے خون آلود ہیں اور ان پر خون کے سیاہ جمے ہوئے لوتھڑے چپکے ہوئے ہیں۔ شہد کی دو مکھیاں میرے آس پاس اڑ رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے کیڑے میرے تن پر چل پھر رہے تھے۔ اپنے کپڑوں پر سے خون کے داغ مٹانے کے لیے میں اپنی آستین کو تھوک سے گیلا کر کے جتنا ان پر رگڑتا، وہ کپڑوں میں اور زیادہ جذب ہو کر اور زیادہ غلیظ ہوتے جاتے۔ یہاں تک کہ میں اپنے جسم پر خون کی ٹھنڈی چپچپاہٹ محسوس کرنے لگا۔

شام پڑ رہی تھی۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں بے ارادہ لاش گاڑی کے پہیوں کے نشانوں پر چل پڑا۔ جب اندھیرا چھا گیا تو وہ نشان بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور میں بے فکر، بے مقصد اور بے ارادہ، آہستہ آہستہ، گھپ اندھیرے میں چلتا رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کہاں پہنچوں گا، کیونکہ میں اس اندھیری گہری رات میں چل رہا تھا جو اس کے بعد، اس کی گہری آنکھوں کو خون کے لوتھڑوں کے درمیان دیکھنے کے بعد میری زندگی پر چھا گئی تھی، کیونکہ وہ آنکھیں جو زندگی کا چراغ تھیں، ہمیشہ کے واسطے بجھ چکی تھیں اور اب میرے لیے کہیں پہنچنا یا کبھی کہیں نہ پہنچنا ایک سی بات تھی۔

ہر طرف گہری چپ کی حکمرانی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے سب نے چھوڑ دیا ہو اور میں نے بے جان چیزوں میں پناہ لے رکھی ہو۔ میرے اور فطرت کے بہاؤ کے درمیان، میرے اور میری روح پر اتر آنے والے گھپ اندھیرے کے درمیان، ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔ یہ خاموشی ایک طرح کی زبان تھی جسے میں نہیں سمجھتا تھا۔ کیف کی شدت سے میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے متلی ہونے لگی اور پاؤں سست پڑ گئے۔ مجھے بے اندازہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ میں راستے کے کنارے پر قبرستان میں چلا گیا اور ایک قبر کے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا اور اپنی حالت پر حیران ہو رہا تھا۔ ناگہاں ایک خشک اور کھرکھراتی ہنسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے چہرہ پھیر کر دیکھا۔ ایک سایہ سا، سر اور بالوں کو گردن پر لپٹی ہوئی شال میں چھپائے، میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور رومال میں لپٹی کوئی چیز اس نے اپنی بغل میں داب رکھی تھی۔ اس نے میری طرف رخ کر کے کہا:

''میرا خیال ہے تم شہر جانا چاہتے ہو۔ راستہ بھول گئے ہو، کیوں؟ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اس وقت رات کو قبرستان میں کیا کر رہا ہوں۔ مگر ڈرو مت، میرا تو سروکار ہی مُردوں سے ہے۔ قبریں کھودنا میرا پیشہ ہے — بُرا کام تو نہیں؟ میں یہاں کے سب کونوں کھدروں سے واقف ہوں۔ مثلاً آج ہی میں ایک قبر کھودنے گیا تو نیچے سے یہ گلدان نکلا۔ تم جانتے ہو؟ یہ راغہ کا گلدان ہے، رے کے قدیم شہر کا۔ فکر مت کرو، یہ کوزہ میں تمھیں اپنی نشانی دیتا ہوں۔ رکھ لو۔''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو قران اور ایک عباسی کے سکے نکالے۔ بوڑھا خشک اور بھیانک ہنسی کے ساتھ بولا:

''اس کی فکر مت کرو، میں تمھیں پہچانتا ہوں۔ تمھارا گھر بھی جانتا ہوں۔ یہاں پاس ہی میری لاشیں لے جانے والی گاڑی کھڑی ہے۔ آؤ تمھیں گھر پہنچا دوں۔ کیوں؟ بس دو قدم پر۔''

اس نے کوزہ میری گود میں ڈال دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہنسی سے اس کے کندھے لرز رہے

تھے۔ میں کوزہ ہاتھ میں تھام کر بوڑھے کے جھکے ہوئے سائے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ایک موڑ پر دو سیاہ گھوڑوں والی ایک شکستہ لاش گاڑی کھڑی تھی۔ بوڑھا مخصوص پھرتی سے اوپر کوچوان کی گدی پر بیٹھ گیا۔ میں بھی گاڑی میں جا کر تابوت کی جگہ میں لیٹ گیا اور اپنا سر اس کے اونچے چھجے کی طرف رکھا تا کہ باہر دیکھ سکوں۔ کوزے کو میں نے اپنے سینے پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

چابک ہوا میں سنسنایا اور گھوڑے زور زور سے ہانپتے ہوئے چل دیے۔ ان کے قدم اونچے اور ہموار اٹھ رہے تھے۔ ان کی ٹاپیں زمین پر آہستہ آہستہ اور بے آواز پڑ رہی تھیں۔ ان کی گردنوں کی گھنٹیاں ابر آلود فضا میں ایک خاص ترنم پیدا کر رہی تھیں۔ بادلوں میں سے ستارے زمین کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے خون کے جمے ہوئے لوتھڑوں میں سے چمکدار آنکھوں کی پتلیاں۔ ایک بے حد گوارا سکون سر سے پاؤں تک مجھ پر چھا گیا۔ صرف گلدان کسی لاش کے بوجھ کی طرح میرے سینے پر رکھا تھا۔ پیچ در پیچ درخت اپنی ٹیڑھی میڑھی شاخوں کے ساتھ یوں لگتے تھے جیسے الجھ کر زمین پر آ رہنے کے خوف سے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے اندھیرے میں کھڑے ہوں۔ عجیب وغریب شکلوں والے الگ الگ بنے ہوئے مکانوں کی قطار راستے کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ ان مکانوں کی کھڑکیاں ویران اور تاریک تھیں۔ ان کی دیواروں سے جگنوؤں کی سی دھیمی دھیمی بیمار روشنی پھوٹ رہی تھی۔ درخت خوفزدگی کی حالت میں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے ہم سے دور جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ان کی جڑوں سے نیلوفر کی بیلیں لپٹ گئی ہیں اور اردگرد کی زمین کو کھا رہی ہیں۔ لاش کے گلتے ہوئے گوشت کی بو مجھ سے لپٹ گئی تھی، جیسے لاش کی بو ہمیشہ سے میرے جسم میں بسی رہی ہو اور میں ساری عمر ایک سیاہ تابوت میں سوتا رہا ہوں اور ایک خمیدہ پشت بوڑھا جس کی شکل میں نہیں دیکھ پاتا، کہرے اور سایوں میں سے مجھے گزارے لیے چلا جا رہا ہو۔

لاش گاڑی ٹھہر گئی اور میں کوزہ ہاتھ میں تھامے، چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ سامنے میرا گھر تھا۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور کوزے کو میز پر رکھ کر کوٹھری میں سے دھات کی صندوقچی لے کر، جو میری تجوری تھی، باہر دروازے پر آیا کہ مزدوری کے بدلے یہ صندوقچی بوڑھے کوچوان کے حوالے کردوں۔ لیکن وہ غائب ہو چکا تھا اور اس کا یا گھوڑا گاڑی کا کوئی نام نشان نہ تھا۔ مایوس ہو کر میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور چراغ روشن کیا۔ پھر میں نے کوزے کو رومال سے نکال کر آستین سے اسے پونچھا۔ اس میں بنفشئی رنگ کی ایک قدیم اور شفاف چمک تھی لیکن اس کا رنگ کچلی ہوئی شہد کی مکھی کا سا ہو گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ایک جانب بادام کی سی شکل بنی ہوئی تھی جس کے گرد نیلوفر کی بیل کا حاشیہ تھا اور اس میں . . .

. . . اس بادام کی شکل کے حاشیے میں اُس کا چہرہ — وہ ایک عورت کے چہرے کی تصویر تھی جس کی آنکھیں سیاہ اور گہری تھیں، عام آنکھوں سے کہیں زیادہ گہری اور سرزنش کرتی ہوئی آنکھیں، جیسے مجھ سے انجانے میں ناقابلِ معافی گناہ سرزد ہو گئے ہوں۔ وہ جادوگر آنکھیں، مضطرب اور حیران، بیک وقت دھمکاتی اور آس دلاتی تھیں، ڈراتی اور اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ان کی گہرائیوں میں مست کر دینے والی ایک ماورائے طبیعی پرچھائیں روشن تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں اٹھی ہوئی، پیشانی بلند، پتلی بھنویں آپس میں ملی ہوئی، بھرے بھرے ہونٹ ادھ کھلے اور بال بے ترتیب تھے اور ایک لٹ کنپٹی پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے پچھلے روز اس کی جو تصویر بنائی تھی اسے دھات کی صندوقچی سے نکالا اور اس تصویر سے ملا کر دیکھا۔ اس میں اور کوزے پر بنے ہوئے نقش میں ذرہ بھر فرق نہ تھا، جیسے وہ ایک دوسرے کے عکس ہوں۔ لگتا تھا دونوں نقش قلمدانوں پر نقاشی کرنے والے ایک ہی بدبخت کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ شاید تصویر بناتے وقت کوزے کے نقاش کی روح مجھ میں داخل ہو گئی تھی اور میرا ہاتھ اس کے اختیار میں آ گیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا شناخت کرنا مشکل تھا سوائے اس کے کہ میرا بنایا ہوا نقش کاغذ پر تھا جبکہ کوزے والی تصویر

میں ایک قدیم اور شفاف چمک تھی جس نے اسے ایک پُراسرار، عجیب اور غیر معمولی روح بخش دی تھی، اوراس شریر روح کی چنگاری سی ان آنکھوں کی تہہ میں چمکتی تھی۔ نہیں، یہ بات باور آنے والی نہیں تھی۔ وہی بے نیاز، گہری اور گریزاں آنکھیں اور وہی پر سکون چہرہ! کوئی نہیں جان سکتا کہ میں کس احساس کے نرغے میں تھا۔ میں خود سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کیا ایسا اتفاق ممکن ہے؟ میری زندگی کی ساری بدبختیاں پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ کیا صرف وہی دو آنکھیں میری زندگی کے لیے کافی نہیں تھیں؟ اب دو ہستیاں، انھی آنکھوں سے جو اس کی ملکیت تھیں، مجھے گھور رہی تھیں۔ نہیں، یہ بالکل نا قابل برداشت تھا۔ وہ آنکھیں، زندگی کی قوت سے سرشار، مجھے دیکھ رہی تھیں جنھیں میں نے خود وہاں پہاڑ کے پہلو میں سرو کے درخت کے پاس، سوکھی نہر کے کنارے سپرد خاک کیا تھا— نیلوفر کے پھولوں کے نیچے، گاڑھے خون اور کیڑوں اور تکلیف پہنچانے والے جانوروں کے درمیان، جو اس کے اردگرد جمع ہو کر جشن کر رہے تھے اور پودوں کے ریشے اس کی پتلیوں میں اتر گئے تھے کہ ان کا عرق چوس لیں۔

میں اپنے اندازے سے بڑھ کر بدبخت اور نفرین زدہ تھا لیکن ساتھ ہی اپنے اندر چھپے ہوئے احساسِ جرم سے مجھے ایک بے وجہ اور عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اب میرا ایک قدیم اور ہمدرد ساتھی تھا۔ کیا وہ قدیم نقاش جس نے سینکڑوں یا شاید ہزاروں سال پہلے اس کوزے پر نقاشی کی تھی، میرا ہمدرد نہیں تھا؟ کیا وہ میری جیسی کیفیت سے نہیں گزرا تھا؟ اس لمحے تک میں خود کو ساری مخلوقات میں سب سے زیادہ بدبخت سمجھتا تھا لیکن مجھے اس زمانے کا خیال آیا جب اس پہاڑ کے قریب پتھر کی بھاری سلوں سے بنے ان ویران مکانوں اور بستیوں میں لوگ رہا کرتے تھے جن کی ہڈیاں بھی اب گل چکیں اور شاید ان کے جسموں کے بعض اجزا نیلوفر کے پھولوں میں زندہ ہوں۔ ان لوگوں کے درمیان فلک کا ستایا ہوا ایک نفرین زدہ نقاش، شاید کوئی مجھ جیسا بدبخت قلمدان ساز، رہتا ہوگا— بالکل مجھ جیسا۔ اور اب میں سمجھتا تھا، صرف میں

سمجھ سکتا تھا کہ وہ بھی ان دو گہری سیاہ آنکھوں میں جلتا اور پگھلتا رہا تھا— بالکل میری طرح۔ اس خیال نے مجھے دلاسا دیا۔

آخر میں نے اپنی بنائی ہوئی تصویر کوزے پر بنے نقش کے پاس رکھ دی۔ پھر میں نے جا کر اپنی مخصوص چلم کو درست کیا اور اچھی طرح سلگا کر ان تصویروں کے پاس لے آیا۔ چند کش لیے اور نشے کے عالم میں ان تصویروں کو خیرہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں اپنے خیالات کو جمع کرنا چاہتا تھا اور صرف افیون کا آسمانی دھواں میرے خیالات کو یکجا اور ذہن کو یکسو کر سکتا تھا۔

میرے پاس جتنی افیون تھی سب میں نے خرچ کر دی تا کہ یہ عجیب وغریب دار و ساری مشکلوں کو، آنکھوں کے سامنے کھنچے سارے پردوں کو اور درد کی یادوں کے خاکستری ہجوم کو محو کر دے۔ میں جس کیفیت کا منتظر تھا وہ آئی اور میرے انتظار سے بڑھ کر آئی۔ میرے خیالات رفتہ رفتہ گہرے، گمبھیر اور طلسماتی ہوتے گئے اور نیند اور نشے کی ملی جلی کیفیت مجھ پر چھا گئی۔

اس کے بعد یوں لگا کہ میرے سینے سے ایک دباؤ اور بوجھ جاتا رہا۔ قانونِ ثقل میرے لیے ختم ہو گیا اور میں آزادی سے اپنے گمبھیر، لطیف اور موشگاف خیالات کے پیچھے پرواز کرنے لگا۔ ایک قسم کا گہرا اور نا قابل بیان کیف سر سے پاؤں تک مجھ پر چھا گیا۔ میں اپنے جسم کے بوجھ سے رہا ہو گیا۔ ایک جہان تھا، پر سکون مگر خوبصورت طلسمی اشکال اور رنگوں سے پُر۔ پھر میرے خیالات کا تار بھی ٹوٹ گیا اور ان رنگوں اور شکلوں میں تحلیل ہو گیا۔ میں ان لہروں میں تیر رہا تھا جو آسمانی عنایتوں سے بھرپور تھیں۔ میں اپنے دل کی آواز سن رہا تھا، شریانوں کی جنبش محسوس کر رہا تھا۔ یہ کیفیت میرے لیے کیف اور معنی سے بھرپور تھی۔

میرا جی کرتا تھا کہ خود کو فراموشی کی نیند کے سپرد کر دوں۔ اگر یہ فراموشی ممکن ہوتی اور ہمیشہ جاری رہ سکتی، اگر میری آنکھیں مند کر نیند سے ماورا کہیں عدم میں گھل جاتیں اور مجھے اپنے ہونے کا احساس نہ رہتا، اگر میری ہستی روشنائی کے ایک قطرے، موسیقی کے سُر یا رنگوں

کی شعاع میں گم ہوسکتی اور اس کے بعد لہریں اور شکلیں پھیل کر نظروں سے محو ہو جاتیں، تو شاید میری آرزو پوری ہو جاتی۔

رفتہ رفتہ بیہوشی اور بے حسی کی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی۔ وہ ایسی لذیذ تھکن اور ایسی لطیف لہروں کی طرح تھی جو میرے جسم سے پھوٹ رہی تھیں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بتدریج میں نے گزرے ہوئے حالات اور واقعات اور مٹی ہوئی یادوں اور بھولے ہوئے بچپن کو دیکھا۔ نہ صرف دیکھا بلکہ اس ہنگامے میں شریک ہوا اور اسے محسوس کیا۔ لحہ بہ لحہ میں اپنے بچپن کی طرف لوٹتا گیا اور اس کے بعد میرے خیالات محو اور تاریک ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ہستی کو ایک گہرے اندھے کنویں میں ایک کنڈے سے لٹکا دیا گیا ہو۔ پھر جیسے میں اس کنڈے سے آزاد ہو گیا اور کنویں میں نیچے ہی نیچے گرنے لگا، لیکن کوئی رکاوٹ میرے گرنے کے راستے میں نہ آئی۔ ایک نہ ختم ہونے والی رات میں، میں ایک اتھاہ گھاٹی میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ وہی پردے جو تار تار ہو کر سامنے سے ہٹ گئے تھے، پھر آنکھوں کے سامنے تن گئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے مکمل فراموشی محسوس ہوئی۔ میں جب اپنے آپ میں آیا تو ایک بار پھر خود کو اسی چھوٹے سے کمرے میں پایا، اسی کیفیت میں جو مجھے بیک وقت عجیب اور فطری معلوم ہو رہی تھی۔

جس نئی دنیا میں میں بیدار ہوا تھا وہ اپنے گرد و پیش اور اپنی وضع میں میرے لیے بالکل آشنا اور قریبی تھی، یہاں تک کہ مجھے اپنی پچھلی زندگی اور اس کے گرد و پیش سے بھی زیادہ اس سے اُنس محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ میری حقیقی زندگی کا عکس ہو۔ یہ ایک دوسری ہی دنیا تھی لیکن میرے اس قدر قریب اور مجھ سے اتنی مربوط کہ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اصل ماحول میں لوٹ آیا ہوں۔ میں نے ایک ایسی دنیا میں جنم لیا جو بیک وقت قدیم تھی اور زیادہ قریبی اور فطری بھی۔

ابھی صبح کا جھٹپٹا ہی تھا۔ ایک تیل کا چراغ میرے کمرے کے طاق میں جل رہا تھا اور ایک بستر بھی کمرے کے ایک گوشے میں لپٹا رکھا تھا، لیکن میں جاگ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم پھنک رہا ہے۔ میری عبا اور شال خون کے داغوں سے بھری تھی اور ہاتھ بھی خون آلود تھے۔ بخار اور دورانِ سر کے اثر سے مجھ میں ایک خاص طرح کا ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا جو خون کے نشانوں کو مٹانے کی فکر سے بڑھ کر شدید تھا؛ اس سے بھی طاقتور کہ ابھی داروغہ آئے گا اور مجھے گرفتار کر لے گا۔ بہر حال بہت عرصے سے میں اس کا منتظر تھا کہ داروغہ آئے، لیکن میرا ارادہ تھا کہ گرفتار کیے جانے سے پہلے میں الماری کے اوپر رکھی زہریلی شراب ایک ہی جرعے میں پی جاؤں گا۔ مجھے لکھنے کی ایسی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی جیسے یہ مجھ پر ایک فرض کی طرح عائد کر دیا گیا ہو۔ میں اس آسیب کو باہر کھینچ لانا چاہتا تھا جس نے مدتوں سے

میرے اندرون کو جکڑ رکھا تھا؛ میں اپنے اندر کی دہشت کو کاغذ پر اتار لینا چاہتا تھا۔ آخر بہت ہچکچاہٹ کے بعد میں نے چراغ اپنے سامنے رکھ لیا اور لکھنا شروع کیا:

میں ہمیشہ یہ سوچا کرتا تھا کہ خاموشی سب سے اچھی چیز ہے اور یہ کہ آدمی کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ دریا کے کنارے، پر پھیلائے بگلے کی طرح اکیلا بیٹھا رہے۔ لیکن اب میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں کیونکہ جو کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا ہے۔ کسے معلوم ... شاید اسی لمحے، یا ایک گھنٹے بعد نشے میں دھت سپاہیوں کا دستہ مجھے گرفتار کرنے آ پہنچے۔ مجھے اپنی لاش کو بچانے کی ذرا بھی فکر نہیں، اور پھر اگر میں خون کے داغ مٹا بھی دوں تو انکار کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ لیکن میں ان کے ہاتھ آنے سے پہلے اوپر کے خانے میں رکھی شراب کی بوتل سے ایک پیالہ پی جاؤں گا۔

اب میں اپنی زندگی کو انگور کے خوشے کی طرح مٹھی میں بھینچ کر اس کا عرق ... نہیں، اس کی شراب قطرہ قطرہ کر کے اپنے سائے کے خشک حلق میں آبِ تُربت کی طرح ٹپکا دینا چاہتا ہوں۔ فقط یہ خواہش ہے کہ جانے سے پہلے اپنے ان دُکھوں کو کاغذ پر لے آؤں جو مجھے کمرے کے اس گوشے میں پڑے پڑے گُھن کی طرح کھاتے رہے ہیں، کیونکہ صرف اسی طرح میں اپنے خیالات کو اچھی طرح مرتب اور منظم کر سکوں گا۔ کیا میرا مقصد وصیت نامہ لکھنا ہے؟ ہرگز نہیں؛ کیونکہ نہ تو میں مال رکھتا ہوں جو دیوان کے ہاتھ آئے اور نہ دین جسے شیطان لے جائے۔ جتنی چیزیں روے زمین پر ہیں ان کی قیمت میرے لیے حقیر ہے۔ زندگی جو کچھ تھی میں نے ہاتھ سے دے دی، ترک کر دی اور چاہا کہ وہ میرے پاس سے چلی جائے۔ جب

میں جا چکا ہوں تو چاہے کوئی میرے کاغذوں کو پڑھ لے یا ستر سال تک کسی کی نگاہ ان پر نہ پڑے۔ میں صرف اس ضرورت سے لکھ رہا ہوں کہ لکھنا مجھ پر لازم ہو گیا ہے۔ میں ہمیشہ سے زیادہ اس بات کا محتاج ہوں کہ اپنے خیالوں اور اپنے سائے کے درمیان رابطہ پیدا کروں۔ وہ منحوس سایہ جو چراغ کی روشنی میں دیوار پر جھکا ہوا میرے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھتا اور نگلتا جاتا ہے۔ یہ سایہ یقیناً مجھ سے زیادہ سمجھتا ہے! میں صرف اسی سے بات کر سکتا ہوں۔ یہی مجھے بات کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی مجھے پہچان سکتا ہے۔ یہ یقیناً سمجھتا ہے... میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا عرق... نہیں، شرابِ تلخ اس کے خشک حلق میں بوند بوند کر کے ٹپکاؤں اور کہوں: ''یہ میری زندگی ہے۔''

اگر کل کوئی مجھے دیکھتا تو اسے ایک تھکا ہوا بیمار جوان آدمی دکھائی دیتا۔ لیکن آج وہ سفید بالوں، جلتی ہوئی آنکھوں اور کٹے ہوئے ہونٹ والا ایک خمیدہ پشت بوڑھا دیکھے گا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نگاہ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں، کیونکہ ہر جگہ مجھے اپنے دوہرے سائے نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کو اپنے جھکے ہوئے سائے پر کھولنے کے لیے ایک کہانی سناتا ہوں۔ آہ، کتنی داستانیں، بچپن، عشق، جماع، شادی اور موت کے بارے میں موجود ہیں اور کسی میں حقیقت نہیں۔ میں کہانیاں کہنے اور عبارتیں گھڑنے سے تھک گیا ہوں۔

میں اس خوشے کو نچوڑنے کی کوشش کروں گا لیکن اس میں ذرہ بھر بھی حقیقت ہو گی یا نہیں، اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں اور یہ آسمان کا ٹکڑا جو میرے سر پر قائم ہے اور یہ چند بالشت زمین جس پر بیٹھا ہوں نیشاپور کی ہے یا بلخ کی یا بنارس کی — مجھے کسی چیز کا یقین نہیں۔

میں نے تو صرف قسم قسم کی چیزیں دیکھی ہیں اور طرح طرح کے الفاظ سنے ہیں۔ میں نے چیزوں کی گھسی ہوئی اوپری سطحوں پر نظر ڈالی ہے — اس نازک اور سخت چھلکے پر جس کے پیچھے روح چھپی ہوتی ہے — اور اب مجھے کسی چیز کا یقین نہیں رہا۔ چیزوں کے بھاری اور ٹھوس

ہونے پر، آشکار اور روشن حقائق پر اس لمحے مجھے شک ہے۔ پتا نہیں اگر میں کونے میں پڑی پتھر کی اوکھلی پر انگلی مار کر اس سے پوچھوں: کیا تم ٹھوس اور حقیقی ہو؟ اور وہ ہاں میں جواب دے، تو میں اس کا یقین کر لوں گا یا نہیں۔

کیا میں ایک الگ اور مشخص وجود رکھتا ہوں؟ معلوم نہیں۔ لیکن ابھی جب میں نے آئینے پر نظر ڈالی تو خود کو نہ پہچان پایا۔ نہیں، وہ پرانا ''میں'' اب مر چکا ہے، گل سڑ چکا ہے، لیکن اُس کے اور میرے درمیان کوئی رکاوٹ، کوئی سرحد نہیں ہے۔ مجھے اپنی کہانی لکھنی ہے، لیکن نہیں جانتا کہ اسے کہاں سے شروع کروں۔ پوری زندگی ہی قصہ کہانی ہے۔ مجھے انگور کے خوشے کو نچوڑ کر اس کا عرق اس عمر رسیدہ سائے کے حلق میں ٹپکانا ہے۔

میں کہاں سے شروع کروں؟ کیونکہ سارے خیالات جو فوری طور پر میرے ذہن میں جمع ہوتے ہیں، اسی لمحے کی ملکیت ہیں اور منٹ، گھنٹے یا دن نہیں رکھتے۔ کل گزرا ہوا کوئی حادثہ میرے لیے ہزاروں سال پہلے کے کسی حادثے کی نسبت زیادہ پرانا اور بے اثر ہو سکتا ہے۔

شاید جب سے زندوں کی دنیا سے میرے سارے بندھن ٹوٹے ہیں، گزرے ہوئے وقت کی یادیں میری آنکھوں کے سامنے نقش بنانے لگی ہیں۔ گزشتہ، آئندہ، ساعتیں، دن، سال اور مہینے میرے لیے یکساں ہیں؛ بچپن اور بڑھاپے کے مختلف مرحلے میرے لیے بے معنی الفاظ کے سوا کچھ نہیں۔ صرف عام لوگوں کے لیے، سفلوں کے لیے — ہاں یہی وہ لفظ ہے جسے میں ڈھونڈ رہا تھا — ان سفلوں ہی کے لیے ان الفاظ میں سچائی ہے، جن کی زندگی کی حدیں اور موسم سال کے موسموں کی طرح متعین ہوتے ہیں اور جن کی زندگی ایک معتدل منطقے میں واقع ہوتی ہے۔ لیکن میری زندگی میں تو ہمیشہ ایک موسم اور ایک کیفیت رہی ہے اور میری تو ساری زندگی ایک سرد اور سدا تاریک منطقے میں گزری ہے۔ ہمیشہ ایک شعلہ جیسے میرے بدن میں جلتا اور مجھے موم کی طرح پگھلاتا رہا ہے۔

کمرے کی چار دیواری میں اور زندگی اور خیالات کے گرد کھنچے ہوے حصار میں میری زندگی موم بتی کی طرح آہستگی سے پگھلتی رہی ہے۔ نہیں، شاید مجھے دھوکا ہوا ہے۔ شاید یہ ایک گیلی لکڑی کی طرح ہے جو چولھے کے ایک کونے میں پڑی پڑی دوسری لکڑیوں کی تپش سے سلگ سلگ کر کوئلہ بن گئی ہے — خود نہ تو جلی ہے اور نہ تر وتازہ ہے، بلکہ صرف دوسروں کے دھویں اور گرمی سے گھٹ گئی ہے۔

میرا کمرہ سارے کمروں کی طرح پتھروں اور اینٹوں سے، ہزاروں قدیم مکانوں کے کھنڈروں پر بنا ہوا ہے۔ اس کی دیواروں پر سفیدی ہے اور اس کے گرد ایک احاطہ کھنچا ہوا ہے۔ یہ بالکل کسی مقبرے کی طرح ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور ان کی تفصیلیں میرے خیالوں کو پہروں مصروف رکھنے کو کافی ہیں — دیوار کے کونے پر اس مکڑی کی طرح۔ کیونکہ جب سے میں اپنے بستر تک محدود ہو گیا ہوں، مجھ پر لوگوں کی توجہ اور بھی کم ہو گئی ہے۔ گھوڑے کی نعل جیسا کھونٹا جو دیوار میں گڑا ہے... کبھی میرا اور میری بیوی کا گہوارہ اس سے لٹکا ہوتا تھا، اور اس کے بعد شاید یہ اَور بچوں کا وزن بھی سہارتا رہا ہے۔ کھونٹے کے بالکل نیچے دیوار کی سفیدی پھول کر جھڑ گئی ہے اور اس کے ریزوں میں سے ان چیزوں اور جانداروں کی بو آتی ہے جو کبھی اس کمرے میں رہ چکے ہیں۔ ہوا کا کوئی جھونکا ان بوجھل ست اور سیلی ہوئی بوؤں کو اُڑا نہیں سکا — پسینے کی بو، پرانی بیماریوں کی بو، منھ کی بو، پیروں کی بو، پیشاب کی تیز بو، سڑتے ہوے روغن کی بو، گلی ہوئی چٹائی کی، جلے ہوے خاگینے کی، تلی ہوئی پیاز کی اور جوشاندے کی بو، بچوں کے پوتڑوں کی بو، گلی سے آتے غبار کی بو، مرے ہوؤں کی اور ان کی بو جو حالِ نزع میں ابھی زندہ ہیں اور اپنا الگ وجود رکھتے ہیں۔ بہت سی دوسری بوئیں بھی ہیں جن کی اصل کا کچھ پتا نہیں چلتا مگر ان کا اثر باقی رہ گیا ہے۔

میرے کمرے کی بغل میں ایک کوٹھری ہے اور دو کھڑکیاں باہر سفلوں کی دنیا پر کھلتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا رخ ہمارے صحن کی جانب ہے اور دوسری کا گلی کی طرف۔ اس

سے میرا تعلق شہرِرے سے قائم ہوتا ہے — اس شہر سے جسے عروسِ دنیا کا نام دیتے ہیں اور جس میں ہزاروں گلیاں ہیں اور ان کے پیچھے اور گلیاں، دھول میں اَٹے ہوئے مکان اور مدرسے اور کارواں سرائیں ہیں۔ یہ شہر جسے دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کرتے ہیں، میرے کمرے کے عقب میں سانس لیتا اور زندگی کرتا ہے۔ یہاں اپنے کمرے کے اس کونے میں، جب میں اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں تو میرے اندر محفوظ شہر کے ملے جلے سائے ایوانوں، مسجدوں اور باغوں کی شکل میں میری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتے ہیں۔

یہ دو کھڑکیاں میرا تعلق باہر کی دنیا سے، سفلوں کی دنیا سے قائم کرتی ہیں۔ لیکن میرے کمرے میں ایک آئینہ ہے جس میں میں اپنی صورت دیکھتا ہوں، اور یہ آئینہ میری محدود زندگی میں سفلوں کی اس دنیا سے زیادہ اہم ہے جس سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔

شہر کے سارے منظروں میں سے میری کھڑکی کے سامنے ایک قصاب کی چھوٹی سی دکان ہے جس میں ہر روز دو بھیڑوں کا گوشت صرف ہو جاتا ہے۔ میں جب بھی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں تو میری نظر قصاب پر پڑتی ہے۔ روز صبح سویرے دو سیاہ اور لاغر گھوڑے، جن کے دونوں طرف بھیڑیں لٹک رہی ہوتی ہیں، دکان کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ یہ گھوڑے ضرور بخار میں جلتے ہوں گے، کیونکہ ان کے گلوں سے گہری اور خشک کھانسی اٹھتی رہتی ہے اور ان کی ٹانگیں یوں لگتی ہیں جیسے کسی وحشیانہ قانون کے تحت ان کے سرے کاٹ کر انھیں کھولتے ہوئے روغن سے داغ دیا گیا ہو۔ قصاب اپنے سنے ہوئے ہاتھ مہندی سے رنگی داڑھی پر پھیرتا ہے، بھیڑوں کی لاشوں پر خریدار کی نگاہ ڈالتا ہے اور پھر ان میں سے دو کو چن کر ان کی چکیوں کو ہاتھ میں تولتا ہے۔ اس کے بعد وہ انھیں لے جا کر دکان کی چوکھٹ پر ٹانگ دیتا ہے۔ گھوڑے زور زور سے ہانپتے آگے چل دیتے ہیں۔ تب قصاب کٹی ہوئی گردنوں، خون میں تر پپوٹوں اور نیلی پڑتی کھوپڑیوں سے باہر کو ابلتی ہوئی آنکھوں والی ان خون میں لت پت لاشوں کو تھپتھپاتا اور پونچھتا ہے۔ پھر ہڈی کے دستے والی چھری سے ان کے جسموں کو بڑی دقت سے بوٹی بوٹی کرتا

ہے اور مسکرا مسکرا کر ان کا گوشت اپنے گاہکوں کو بیچتا ہے۔ کس لذت سے وہ یہ سب کام انجام دیتا ہے! مجھے یقین ہے وہ ان سے ایک طرح کا کیف اور مزہ حاصل کرتا ہے۔ وہ زرد سے رنگ کا کتا جس نے ہمارے محلے کو اپنا علاقہ بنا رکھا ہے اور جو ہمیشہ ٹیڑھی گردن اور بے گناہ آنکھوں سے قصاب کے ہاتھوں کو حسرت کے ساتھ تکا کرتا ہے، وہ بھی ان سب چیزوں سے واقف ہے؛ وہ بھی جانتا ہے کہ قصاب کو اپنے کام سے کیا لذت ملتی ہے۔

تھوڑی دور ایک محراب کے نیچے ایک عجیب وضع قطع کا ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہے اور اس نے اپنے سامنے ایک چوڑی بساط بچھا رکھی ہے۔ اس بساط پر وہ دو نعلیں، چند رنگ برنگے منکے، ایک چھری، چوہے دان، ایک زنگیائی ہوئی سنسی، ایک ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی، ایک بیلچہ اور ایک چمکدار کوزہ رکھے بیٹھا ہے۔ کوزے کو وہ اپنے گندے رومال سے ڈھانپے رکھتا ہے۔ میں اپنی کھڑکی سے اسے گھنٹوں، دنوں، مہینوں دیکھتا رہا ہوں۔ وہ ہمیشہ ایک گندی شال اوڑھے اور ایک شُستری عبا پہنے رہتا ہے جس کے کھلے گریبان سے اس کے سینے کے سفید بال دِکھتے رہتے ہیں۔ اس کے پپوٹے جلے ہوئے ہیں، جیسے کوئی منحوس اور ڈھیٹ بیماری انھیں کھا رہی ہو۔ بازو پر ایک تعویذ بندھا ہے اور وہ ہمیشہ ایک ہی انداز میں بیٹھا رہتا ہے۔ صرف جمعے کی رات کو وہ اپنے پیلے چھدرے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے قرآن پڑھا کرتا ہے۔ شاید اسی سے وہ اپنی روزی کماتا ہوگا، کیونکہ میں نے کبھی کسی کو اس سے کچھ خریدتے نہیں دیکھا۔ یوں لگتا ہے، میں جو کابوس دیکھتا رہا ہوں ان میں اسی شخص کی شکل نظر آتی رہی ہے۔ کون سے سفلی اور احمقانہ خیالات اس کے اس منڈے ہوئے سبزی مائل سر میں، اس کی تنگ پیشانی کے پیچھے، غلیظ خودرو گھاس کی طرح اُگ رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے کے سامنے بچھے ہوئے توشہ دان اور اس پر رکھی ہوئی اِدھر اُدھر کی چیزوں کا اس کی زندگی سے خاص تعلق ہے۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس سے بات کروں یا کوئی چیز خریدوں، لیکن ہمت نہ ہوئی۔

میری آیا نے مجھے بتایا کہ یہ شخص جوانی میں کوزہ گر رہا تھا اور صرف یہی ایک کوزہ اس نے بچا کر اپنے لیے رکھ لیا تھا اور اب خوردہ فروشی سے روزی حاصل کرتا ہے۔

باہر کی دنیا سے میرا فقط اتنا ہی تعلق رہا ہے اور گھر کی دنیا میں صرف میری آیا اور ایک فاحشہ بیوی باقی بچی تھی، لیکن میری آیا اس کی بھی آیا تھی۔ میں اور میری بیوی قریبی رشتے دار تھے اور آیا ہی نے ہم دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ اسی کی ماں کو میں اپنی ماں سمجھتا تھا کیونکہ میں نے اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا، اور اس اونچے قد اور خاکستری بالوں والی عورت، اس کی ماں، ہی نے مجھے پالا تھا۔ میں اس کی ماں کو اپنی ماں کی طرح چاہتا تھا اور اسی تعلق کی وجہ سے میں نے اس کی لڑکی کو اپنی زوجہ بنایا۔

اپنے ماں باپ کے بارے میں میں نے کئی کہانیاں سن رکھی ہیں، لیکن جو کہانی مجھے آیا نے سنائی ہے وہی مجھے لگتا ہے کہ سچ ہوگی۔ آیا نے مجھے بتایا کہ میرا باپ اور چچا توام بھائی تھے۔ ان دونوں کی شکلیں، قد بت اور عادتیں یکساں تھیں، یہاں تک کہ ان کی آوازیں بھی ایک سی تھیں اور ان میں فرق کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں ایک غیر مرئی تعلق اور احساسِ ہمدردی بھی تھا کہ اگر ایک بیمار پڑتا تو دوسرا بھی بیمار پڑ جاتا۔ کسی کے کہنے کے مطابق وہ ایک سیب کی طرح تھے جسے دو ٹکڑے کر دیا گیا ہو۔ آخر دونوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور بیس برس کی عمر میں ہندوستان چلے گئے۔ وہ رے کی اجناس — یعنی مختلف قسم کے کپڑے مثلاً فیرہ، پارچۂ گلدار، سوتی کپڑا، جبے، شالیں، سوئیاں، مٹی کے برتن، اور قلمدانوں کے ڈھکنے — ہندوستان لے جا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا باپ شہر بنارس میں رہا کرتا تھا اور میرے چچا کو ہندوستان کے دوسروں شہروں میں تجارت کے کاموں سے بھیجا کرتا۔ کچھ مدت بعد میرا باپ ایک دوشیزہ بیگم داسی پر عاشق ہو گیا جو لنگم کے مندر کی رقاصہ تھی۔ اس لڑکی کا کام بڑے لنگ کے سامنے پوجا کا رقص کرنا اور مندر کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ وہ زیتونی رنگت والی ایک گرم جوش لڑکی تھی جس کے پستان لیموں کی شکل کے، آنکھیں ہرنی کی سی گہری اور

بھنویں باریک اور آپس میں ملی ہوئی تھیں اور ان کے بیچ میں وہ ایک سرخ بندی لگایا کرتی تھی۔

اب میں تصور نہیں کرسکتا کہ بیگم داسی یعنی میری ماں کی رنگین زردوزی کی ساڑھی، کھلے ہوئے سینے اور دیبا کی اوڑھنی نے؛ ازلی رات کی مانند گہرے سیاہ بالوں اور سر کی پشت پر بندھے جوڑے، کنگن اور پائل اور نتھنی نے، گہری سیاہ مدھ ماتی ہرنی کی سی آنکھوں اور چمکیلے دانتوں نے؛ اور ستار، ڈھولک، تنبورے اور نرسنگھے کی دُھن پر، پگڑی باندھے ہوئے مردوں کی بجائی ہوئی مدھم، ہموار اور پُرمعنی دُھن پر، اس کی نرت کی ڈھلی ہوئی مدراؤں نے جس میں ہندوستانیوں کی جادوگری، دیومالا اور جذبوں اور دکھوں کے تمام اسرار جمع ہو گئے تھے، اس کی متناسب حرکات اور شہوانی اشارات نے؛ اس کے مقدس رقص نے جس میں وہ ایک کلی کی طرح کھلتی تھی اور اپنے کندھوں اور بانہوں کو پوری لمبائی میں لہراتی تھی اور خم دے کر پھر اکٹھا کرتی تھی؛ ان حرکات نے جن میں ایک خاص مفہوم ہوتا تھا اور جو بغیر لفظوں کے گفتگو کرتی تھیں، میرے باپ پر کیا اثر کیا ہوگا۔ خاص طور پر اس کی گھنی گرم خوشبو موگرے اور صندل کی خوشبوؤں سے مل کر اس منظر کو ایک شہوت انگیز مفہوم دے دیتی تھی۔ یہ عطر جو دور دراز کے درختوں کے رس کی خوشبو رکھتا ہے اور مبہم اور گم شدہ احساسات میں جان ڈال دیتا ہے؛ اور بچوں کے کمروں میں رکھی جانے والی ان دواؤں کی بو جو ہندوستان سے آتی ہیں، قدیم رسموں اور آداب اور معنی سے بھری اس سرزمین سے آنے والے یہ انجانے روغن — مجھے لگتا ہے کہ میرے جوشاندے میں بھی یہی بو ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں نے میرے باپ میں دور دراز کی اور گشتہ شدہ یادیں بیدار کر دیں اور وہ بیگم داسی کا اس قدر چاہنے والا ہو گیا کہ اس رقاصہ کا مذہب، لنگ پوجا کا مذہب، اختیار کر لیا۔ لیکن جب وہ حاملہ ہوئی تو اسے مندر کی دیکھ بھال کے کام سے فارغ کر دیا گیا۔

میں ابھی دنیا میں آیا ہی تھا کہ میرا چچا مسافرت سے واپس بنارس لوٹ آیا۔ لیکن جیسا

کہ وہ اپنی سرشت اور اپنے عشق میں میرے باپ کی طرح تھا، وہ ایک نہیں سو جان سے میری ماں پر عاشق ہو گیا اور آخر اسے دھوکا دیا کیونکہ میرے باپ سے ظاہری اور معنوی شباہت کی وجہ سے یہ کام اس کے لیے آسان تھا۔ جب یہ بھید کھلا تو میری ماں نے کہا کہ وہ ان دونوں کو چھوڑ دے گی ورنہ دونوں کو ناگ کے امتحان سے گزرنا ہوگا اور جو اس میں جیتا بچے گا اُسی کی ہو جائے گی۔

آزمائش یہ تھی کہ میرے باپ اور چچا دونوں کو ایک ساتھ ایک سیاہ تاریک غار میں ڈال دیا جاتا جس میں ایک ناگ پہلے سے موجود ہوتا جو اِن میں سے کسی کو ڈس لیتا۔ ڈسے جانے والے کی چیخ بلند ہونے پر سپیرا اندر گھس کر دوسرے کو بچا لاتا اور بیگم داسی اسی کی ہو جاتی۔

اندھیرے غار میں ڈالے جانے سے پہلے میرے باپ نے ایک بار بیگم داسی کا رقص، پوجا کا مقدس ناچ دیکھنے کی خواہش کی، جسے اس نے مان لیا اور وہ سپیرے کی بین پر، مشعلوں کی روشنی میں اپنی معنی خیز، موزوں اور جھومتی ہوئی مدراؤں کے ساتھ ناچنے اور ناگ کی طرح بل کھانے لگی۔ پھر میرے باپ اور چچا کو ناگ کے ساتھ اس اندھیرے غار میں ڈال دیا گیا۔ بیتاب فریاد کی جگہ ایک دیوانہ وار نالے میں ملی ہوئی ایک دہشت ناک ہنسی کی آواز بلند ہوئی۔ دروازہ کھولا گیا تو میرا چچا غار سے باہر آیا۔ اس کی حالت بوڑھوں کی طرح شکستہ تھی اور بیم و ہراس کی شدت اور خشمگیں ناگ کی سرسراہٹ، شرربار آنکھوں، زہر بھرے پھن اور اس کے چھوٹے سے سر والے، چکنی گردن جیسے جسم کی دہشت سے اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ شرط کے مطابق بیگم داسی میرے چچا کی ہو گئی۔ لیکن دہشت ناک بات یہ تھی کہ یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ زندہ بچنے والا شخص میرا باپ تھا یا چچا۔

چونکہ اس آزمائش سے اس کا دماغ اُلٹ گیا تھا اور وہ اپنی پچھلی زندگی کو بالکل فراموش کر چکا تھا، وہ بچے کو نہیں پہچانتا تھا، اس سے خیال کرتے تھے کہ وہ میرا چچا رہا ہوگا۔ کیا اس قصے

کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں؟ اور اس دہشت ناک ہنسی اور اس آزمائش کی وحشت نے مجھ پر کوئی اثر نہیں چھوڑا؟

اس کے بعد میں سوائے ایک اور کھانے والے جی کے، اور ایک بیگانہ چیز کے، کچھ نہ رہ گیا۔ آخر میرا چچا، یا باپ، اپنی تجارت کے کام سے بیگم داسی کے ساتھ رے کو لوٹ آیا اور مجھے لاکر میری پھوپھی کو سونپ دیا۔

آیا کہتی تھی کہ جاتے وقت میری ماں نے ایک ارغوانی شراب کی بوتل، جس میں ایک ہندی ناگ کا زہر گھلا ہوا تھا، میرے لیے میری پھوپھی کو دی۔ ایک بیگم داسی اس سے بڑھ کر کیا نشانی اپنے بچے کو دے سکتی تھی؟ ارغوانی شراب، ہمیشہ کی آسودگی بخشنے والا اکسیرِ مرگ — شاید اس نے بھی انگور کے خوشے کی طرح اپنی زندگی کو نچوڑ کر اس کی شراب مجھے بخش دی، اسی زہر میں سے جس نے میرے باپ کو ہلاک کیا تھا۔ اب میں سمجھا کہ اس نے مجھے کیسی انمول سوغات دی تھی۔

کیا میری ماں زندہ ہے؟ شاید اس وقت جب میں لکھنے میں مشغول ہوں، وہ ہندوستان کے کسی دور دراز میدانی شہر میں مشعلوں کی روشنی میں ناگ کی طرح بل کھا کھا کر ناچ رہی ہوگی، جیسے ناگ کی ڈسی ہوئی ہو، اور عورتیں اور بچے اور مرد — برہنہ اور محو — اس کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہوں گے، اور میرا باپ، یا چچا، سفید بالوں اور خمیدہ کمر کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا اسے ناچتے دیکھ رہا ہوگا اور اس کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی ہوں گی اور گردن سانپ کے پھن کی طرح، اور گردن کی پشت پر عینک کا سیاہ پڑتا ہوا خاکستری نشان ہوگا اور وہ تاریک غار اور خشمناک سانپ کی سرسراہٹ کی یاد میں سر اونچا کیے کھویا ہوا بیٹھا ہوگا۔

بہرحال، میں دودھ پیتا بچہ ہی تھا کہ اس آیا کی گود میں ڈال دیا گیا اور اس نے میری پھوپھی کی بیٹی، اس حرافہ، میری بیوی، کو بھی دودھ پلایا اور یوں میں نے اپنی پھوپھی، اس

او نچے قد اور خاکستری بالوں والی عورت، کے ہاتھوں اس کی بیٹی کے ساتھ اسی گھر میں پرورش پائی۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، پھوپھی کو اپنی ماں کی جگہ سمجھ کر اس سے محبت کی ہے — اتنی محبت کہ اس کی بیٹی کو، اپنی دودھ شریک بہن کو اپنی بیوی بنایا کیونکہ وہ اس کی شبیہ تھی۔

یا یوں کہنا چاہیے کہ میں اسے اپنانے پر مجبور ہو گیا۔ صرف ایک بار اس لڑکی نے خود کو میرے سپرد کیا، اور وہ بھی اپنی ماں کی لاش کے سرہانے۔ میں اُس وقت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ خاصی رات گزر چکی تھی۔ جب سارے لوگ سو گئے تو میں، قمیص اور زیر جامہ پہنے، آخری دیدار کے لیے مردے کے کمرے میں گیا۔ دیکھا، اس کے سرہانے دو کافوری شمعیں جل رہی تھیں اور پیٹ پر قرآن دھرا تھا کہ شیطان اس کے جسم میں حلول نہ کر جائے۔ میں نے کپڑا ہٹا کر پھوپھی کا وہی باوقار اور پرکشش چہرہ دیکھا۔ یوں لگتا تھا کہ تمام زمینی رشتے اس کے چہرے میں سے تحلیل ہو گئے ہیں۔ اس کیفیت نے مجھے سر جھکا لینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود موت مجھے معمول کے مطابق اور فطری واقعہ معلوم ہو رہی تھی۔ ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں خشک ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر باہر چلا جانا چاہا، لیکن آہٹ پر چونک کر حیرت سے دیکھا کہ یہی حرافہ جو اَب میری بیوی ہے، کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی مردہ ماں کے سامنے مجھ سے چمٹ گئی اور منھ بھر بھر کے میرے بوسے لینے لگی۔ میں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ مردہ پھوپھی اپنی ریک زدہ دانتوں سے گویا ہم پر ہنس رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی پرسکون مسکراہٹ بدل سی گئی ہو۔ میں نے بے اختیار ہو کر اس حرافہ کو آغوش میں کھینچ لیا اور اس کا بوسہ لینے ہی لگا تھا کہ کمرے کا پردہ ہٹا اور میری پھوپھی کا شوہر، اس حرافہ کا باپ، خمیدہ پشت اور گردن پر لپٹی شال کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی خشک اور کھرکھراتی آواز میں ہنسا اور اس کے کندھے لرزنے لگے، لیکن اس نے ہماری طرف نگاہ نہیں کی۔ میں مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گیا۔ دل چاہتا تھا کہ مردہ پھوپھی کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤں جو تمسخر سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ کیسی ذلت! میں ہراساں ہوکر کمرے سے باہر آیا۔ یہ سب اسی حرافہ کا کیا دھرا تھا۔ شاید اس نے یہ چال اسی لیے چلی تھی کہ میں اسے اپنانے پر مجبور ہو جاؤں۔

باوجود اس کے کہ ہم دودھ شریک بہن بھائی تھے، میں نے اس سے شادی کر لی کہ ان کی عزت خاک میں نہ مل جائے۔

چونکہ یہ لڑکی کنواری نہیں تھی — یہ میں نہیں جانتا تھا۔ جانتا بھی کیسے؟ مجھے تو لوگوں سے پتا چلا — شبِ عروسی کو جب ہم کمرے میں تنہا ہوئے تو میں نے کتنا ہی التماس کیا، وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور کپڑے نہ اتارے۔ کہنے لگی، ''میں کپڑوں سے ہوں۔'' اس نے مجھے اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا اور چراغ بجھا کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا سوئی۔ وہ یوں بید کی طرح کانپ رہی تھی جیسے اسے اژدہے کے ساتھ غار میں دھکیل دیا گیا ہو۔ کوئی باور نہ کرے گا، اور یہ باور آنے والی بات بھی نہیں، کہ اس نے مجھے اپنے ہونٹ تک نہ چومنے دیے۔ دوسری رات بھی میں اسی طرح جا کر فرش پر سو رہا، اور اس کے بعد کی راتوں کو بھی یہی ہوا اور مجھے کچھ بھی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مدتیں گزر گئیں اور میں کمرے کے اس کونے میں فرش پر سوتا رہا۔ کون یقین کرے گا؟ دو ماہ، نہیں دو ماہ اور چار روز تک، یہی معمول رہا کہ میں اس سے دور زمین پر سویا کرتا اور اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

اس نے ایک رومال پہلے سے تیار کر رکھا تھا، شاید اس پر کبوتر کا خون چھڑک رکھا تھا یا شاید اسے اپنی عشق بازی کی پہلی رات سے اس لیے سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا کہ میرا زیادہ سے زیادہ مذاق اڑا سکے۔ اس وقت سب مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کر رہے تھے اور شاید ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، ''ہمارے یار نے کل رات

قلعہ ڈھا دیا۔'' اور میں نے بھی خوشی کا منہ بنا رکھا تھا۔ وہ مجھ پر ہنس رہے تھے، میرے گدھے پن پر ہنس رہے تھے۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ ایک نہ ایک روز ان باتوں کو لکھ ڈالوں گا۔

میں بعد میں سمجھا کہ اس کے دائیں بائیں جو لوگ تھے وہ اس کے عاشق تھے۔ شاید اسے مجھ سے اس لیے نفرت تھی کہ قاضی نے صرف عربی کے کچھ کلمے پڑھ کر اسے میرے اختیار میں دے دیا تھا جبکہ وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ آخر ایک رات میں نے اس سے زبردستی کرنے کا ارادہ کرلیا اور اس پر عمل بھی کیا لیکن سخت کشمکش کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چلی گئی۔ اور میرے بہلاوے کے لیے صرف بستر میں اس کے جسم کی بچی کھچی گرمی اور خوشبو رہ گئی۔ اگر میں کبھی سکون کی نیند سویا تو اُسی رات۔ اس رات کے بعد اس نے اپنا کمرہ الگ کرلیا۔

رات کو جب میں گھر آتا تو وہ ابھی تک نہ لوٹی ہوتی۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ آ چکی ہوگی یا نہیں، اور میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں تنہائی اور موت کا محکوم ہو گیا تھا۔ میں کسی نہ کسی وسیلے سے اس کے آشناؤں سے رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر بھی کوئی یقین نہ کرے گا۔ میں جس کسی کے بارے میں سنتا کہ وہ اسے پسند آیا ہے تو ہزار کوشش سے اس تک جا پہنچتا اور ہر طرح کی ذلت اور خفت اٹھا کر اس سے واقفیت پیدا کرتا، اسے ہموار کرتا اور خوشامدانہ باتیں کر کے اسے بہلا پھسلا کر لے آتا۔ اور اس کے آشناؤں میں کیا کیا لوگ تھے — خوانچہ فروش، فقیہ، کلیجی بھوننے والے، رئیس، داروغہ، مفتی، سوداگر، فلسفی — جن کے ناموں اور القاب میں فرق تھا لیکن تھے سب کے سب ایک ہی حقیر درجے کے۔ مگر سب کی حیثیت مجھ سے بلند تھی۔ کیسی خفت اور خواری سے میں نے خود کو حقیر اور ذلیل کیا — کوئی یقین نہیں کرے گا۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں میری بیوی مجھے چھوڑ نہ جائے۔ میں اس کے عاشقوں سے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور دل موہنے کے طریقے سیکھنا چاہتا تھا لیکن میں ایک بدبخت دلال تھا کہ سارے احمق میرے منہ پر ہنستے تھے۔ میں کس طرح ان سفلوں کی چال ڈھال

اور طور طریقے سیکھ سکتا تھا جبکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے حیا، احمق اور متعفن ہونے ہی کی وجہ سے اسے عزیز ہیں۔ اس کا عشق غلاظت اور موت کا توام تھا۔ کیا میں واقعی اس کے ساتھ سونے کی خواہش رکھتا تھا؟ کیا مجھے اس کی ظاہری صورت نے دیوانہ کرلیا تھا یا اس کے گریز یا اس کے طور طریقوں نے، یا بچپن سے مجھے اس کی ماں سے جو محبت تھی اس نے؟ یا پھر ان سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مجھے گھیر لیا تھا؟ نہیں، میں نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس عورت نے، اس حرافہ نے، اس ساحرہ نے، نہ جانے میری ہستی، میری روح میں کیسا زہر گھول دیا تھا کہ نہ صرف میں اسے چاہتا تھا بلکہ میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے جسم کے ذرے ذرے کی طلب کرتا اور اس طلب میں پکار کرتا تھا۔ میری شدید آرزو تھی کہ وہ کسی گم شدہ جزیرے پر میرے ساتھ ہوتی اور کسی اور آدم زاد کا وہاں وجود نہ ہوتا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی زلزلہ یا طوفان یا آسمانی بجلی ان سب سفلوں کو جو میرے کمرے کی دیوار کے دوسری طرف سانس لیتے اور جیتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں، ختم کر دے اور صرف میں اور وہ باقی رہ جائیں۔

لیکن اس وقت بھی کیا وہ کسی جانور، کسی ہندوستانی سانپ یا اژدہے کو مجھ پر فوقیت نہیں دے گی؟ میں آرزو کرتا تھا کہ صرف ایک رات اس کے ساتھ گزرے اور پھر دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں مر جائیں۔ مجھے اپنے وجود اور اپنی زندگی کا یہ بہترین انجام محسوس ہوتا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ حرافہ میرے قید میں ہونے سے لذت اٹھاتی ہو، جیسے جو درد مجھے کھائے جا رہا تھا، کافی نہ تھا۔ آخر میں سارے کام کاج ترک کر کے خانہ نشین ہو گیا— ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح۔ ہمارے درمیان کے بھیدوں کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بوڑھی آیا جو میری بتدریج موت میں میری غم گسار تھی، مجھے سرزنش کرتی تھی، اسی حرافہ کے سلسلے میں۔ اپنے سر کے پیچھے، اپنے اردگرد، میں سرگوشیاں سنا کرتا تھا: ''بیچاری عورت کس طرح اپنے پاگل شوہر کے ساتھ

گزارہ کرے۔'' وہ حق پر تھے، کیونکہ میں جس قدر ذلیل ہو چکا تھا وہ باور آنے والی بات نہیں تھی۔

میں روز بروز گھلتا چلا گیا۔ جب آئینے میں خود پر نگاہ کرتا تو رخسار قصاب کی دکان پر لٹکے گوشت کی طرح عنابی نظر آتے۔ پنڈا جلتا تھا اور آنکھیں ایک نشے اور غم کی کیفیت میں ہوتی تھیں۔

مجھے اپنی حالت میں لذت محسوس ہونے لگی۔ مجھے آنکھوں میں موت کا غبار نظر آتا، رخصت کا اشارہ۔

آخر حکیم باشی کو خبر کی گئی۔ حکیم باشی ہمارا خاندانی حکیم تھا جس نے اپنے بقول ہمیں پالا پوسا تھا۔ وہ اپنے کڑھے ہوئے عمامے اور تین بالشت لمبی داڑھی کے ساتھ وارد ہوا۔ اسے فخر تھا کہ اس نے میرے دادا کو قوت باہ بڑھانے کی دوا دی تھی، میرے حلق میں جڑی بوٹیوں کے سفوف ڈالے تھے اور میری پھوپھی کی ناف پر فلوس باندھے تھے۔ اس نے میرے سرہانے بیٹھ کر میری نبض دیکھی، زبان دیکھی اور ہدایت کی کہ مجھے گدھی کا دودھ پلایا جائے اور دن میں دو مرتبہ دھونی دی جائے۔ اس نے آیا کو کچھ لمبے چوڑے نسخے بھی دیے جن میں عجیب وغریب روغنوں اور جوشاندوں کے نام لکھے ہوئے تھے، مثلاً پرزوفا، زیتون، کافور، پرسیاوشان، روغن بابونہ، تخم صنوبر، رب سوس، تخم کتان اور دوسری الابلا۔

میری حالت اور خراب ہوگئی۔ فقط میری آیا، جو اس کی بھی آیا تھی، اپنے بوڑھے چہرے اور راکھ کے رنگ کے بالوں کے ساتھ میرے سرہانے بیٹھی رہتی، میری پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی اور مجھے دوائیں پلاتی۔ وہ مجھے میرے اور اس حرافہ کے بچپن کی باتیں سنایا کرتی۔ مثلاً اس نے مجھے بتایا کہ میری بیوی کو بچپن ہی سے بائیں ہاتھ کا ناخن چبانے کی عادت تھی اور کبھی کبھی تو اس سے زخم پڑ جاتا تھا۔ وہ مجھے کہانیاں بھی سناتی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ یہ کہانیاں میری عمر کو پیچھے لوٹا لے گئی ہیں اور میں پھر سے اپنے بچپن میں پہنچ گیا ہوں کیونکہ

وہ کہانیاں میرے بچپن کی یادوں سے تعلق رکھتی تھیں جب میں بہت چھوٹا سا تھا اور میں اور میری بیوی ایک ہی بڑے سے پالنے میں سویا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی قصے دہرایا کرتی تھی۔ بہت سی باتیں جو اس وقت ان قصوں میں قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتی تھیں، اب مجھے بالکل فطری لگتی ہیں۔

چونکہ بیماری نے مجھ میں ایک نئی دنیا پیدا کردی تھی، ایک انجانی اور مٹی ہوئی سی دنیا جو ایسی تصویروں اور رنگوں اور خواہشوں سے پُر تھی جن کا سلامتی کی حالت میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، میں ان پرانے قصوں کی گیرودار کو خود میں ایک ناقابلِ بیان کیف اور اضطراب کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں پھر سے اپنے بچپن میں پہنچ گیا ہوں اور لکھنے کے دوران بھی انھی احساسات میں شریک ہوں اور یہ احساسات اسی وقت سے تعلق رکھتے ہیں اور گزرے ہوے وقت کی ملکیت نہیں ہیں۔

گزرے ہوؤں کی حرکات، خیالات، آرزوئیں اور عادتیں جو اِن قصوں کے ذریعے بعد کی پیڑھی تک پہنچیں، گویا زندگی کے واجبات میں سے ہیں۔ ہزاروں سال سے لوگ وہی الفاظ بولتے ہیں، اسی طرح جماع کرتے ہیں، انھی بچگانہ مصروفیتوں میں گم ہیں... کیا زندگی سراسر ایک مضحکہ خیز، احمقانہ اور ناقابلِ یقین قصہ نہیں ہے؟ کیا خود میں بھی اپنا قصہ نہیں لکھ رہا ہوں؟ قصہ کہنا فقط ناکام آرزوؤں کے لیے ایک راہِ فرار ہے؛ نارسا آرزوئیں جنھیں ہر قصہ کہنے والا اپنی محدود اور موروثی روحیہ کے مطابق تصور کرتا ہے۔

کاش یوں ہوتا کہ میں اپنے نادان بچپن کی مانند آرام سے بے فکر نیند سوسکتا۔ اب جاگتے ہوے تو میرے رخسار قصاب کی دکان پر لٹکے گوشت کی مانند عنابی ہو گئے ہیں، جسم پھنک رہا ہے اور میں کھانس رہا ہوں — کیسی گہری اور ہیبت ناک کھانسی؛ نہ جانے یہ میرے جسم کے اندر کی کس گہری کھوہ سے اٹھتی ہے۔ یہ کھانسی بالکل ان گھوڑوں کی کھانسی کی طرح ہے جو صبح سویرے قصاب کی دکان پر ذبح شدہ بھیڑیں ڈھو کر لاتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھپ اندھیرے میں میں غنودگی کی حالت میں پڑا سونے سے پہلے خود سے باتیں کر رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا، اور پھر یقین ہو گیا، کہ میں پھر سے اپنے بچپن میں پہنچ گیا ہوں اور پالنے میں پڑا ہوں۔ مجھے لگا جیسے کوئی میرے پاس ہے۔ گھر کے سب لوگ بہت دیر ہوئی سو چکے تھے، سویرا ہونے والا تھا، اور بیمار لوگ جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر زندگی دنیا کی سرحد سے باہر نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میرا دل شدت سے جل رہا تھا لیکن مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں لیکن میں کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ تاریکی بہت گہری اور گھنی تھی۔ چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے خود سے کہا، ''شاید وہ ہے۔'' اسی لمحے مجھے اپنے جلتے ہوئے ماتھے پر کسی کا ٹھنڈا ہاتھ محسوس ہوا۔

میں لرز گیا۔ دو تین بار خود سے پوچھا، ''کیا یہ موت کے فرشتے کا ہاتھ نہیں تھا؟'' پھر مجھے نیند آ گئی۔ صبح جب میں جاگا تو آیا نے بتایا کہ لڑکی (یعنی میری بیوی، وہ حرافہ) میرے سرہانے آئی تھی اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر بچے کی طرح جھلاتی رہی تھی۔ گویا اس میں ماتا بیدار ہو گئی تھی۔ کاش میں اسی وقت مر گیا ہوتا۔ شاید وہ بچہ جو اس کے پیٹ میں تھا مر گیا تھا، یا شاید وہ دنیا میں آ گیا تھا— مجھے کچھ معلوم نہیں۔

اس کمرے میں، جو میرے لیے ہر دم قبر سے زیادہ تنگ اور تاریک ہوتا جاتا تھا، آیا میری بیوی کے آنے کی منتظر تھی۔ لیکن وہ نہ آئی۔ کیا اسی کے ہاتھوں میں اس حال کو نہیں پہنچا تھا؟ یہ کوئی مذاق نہیں۔ تین سال نہیں، دو سال اور چار ماہ ہو گئے تھے — لیکن دن اور مہینے کیا ہیں؟ یہ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جو قبر میں پڑا ہو اس کے لیے وقت بے معنی ہے۔ یہ کمرہ میرے خیالات اور میری زندگی کی قبر تھا۔ دوسرے، سفلے جن کے جسم اور روحیں ایک جیسی بنائی گئی ہیں، ان کی زندگی کی ساری چہل پہل اور آوازیں اور زندگی کے سارے مظاہرے میرے لیے عجیب اور بے معنی ہو گئے ہیں۔ جب سے میں بستر پر پڑا ہوں، ایک

عجیب اور نا قابل یقین دنیا میں میری آنکھ کھلی ہے، مجھے ان سفلوں کی ذرا بھی ضرورت نہیں رہی۔ میں اس دنیا کے کونوں کھدروں کو کھوجنے میں لگ گیا جو خود میرے اندر تھی اور انجانی چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔

رات کو جس وقت میرا وجود دو دنیاؤں کی سرحد پر ہچکولے کھا رہا ہوتا، ایک گہری اور خالی نیند میں غرق ہو جانے سے ذرا پہلے میں ایک خواب میں پہنچ جاتا۔ پلک جھپکتے ہی میں اپنی زندگی سے الگ ایک اور زندگی بسر کرنے لگتا اور بہت دور نکل جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں خود سے بھاگ جانا چاہتا ہوں اور اپنی سرنوشت کو بدل ڈالنا چاہتا ہوں۔ جوں ہی میں آنکھیں بند کرتا، میری اپنی حقیقی دنیا مجھ پر کھل جاتی۔ یہ تصویریں جو مجھے نظر آتیں، اپنی خاص زندگی رکھتی تھیں اور آزادی سے غائب اور پھر نمودار ہوتی رہتی تھیں؛ میرے ارادے کا ان پر کوئی بس نہ چلتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی یقینی نہیں۔ جو مناظر میرے سامنے مجسم ہوتے تھے وہ عام قسم کے خواب نہیں تھے کیونکہ میں ابھی تک نیند میں نہیں ہوتا تھا۔ اس منظر کے سکوت اور اطمینان میں میں ان تصویروں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے اور جوڑ کر دیکھا کرتا۔ مجھے لگتا تھا کہ اب سے پہلے میں نے خود کو نہیں پہچانا تھا۔ میں دنیا کا جہاں تک تصور کرتا تھا وہ اپنا مفہوم اور اپنی قوت کھو چکی تھی اور اس کی جگہ رات کے اندھیرے کی حکمرانی تھی، کیونکہ رات پر نگاہ کرنا اور اس سے محبت کرنا مجھے نہیں سکھایا گیا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرا بازو میرے اختیار میں تھا یا نہیں۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ اگر میں اپنے بازو کو اس کی مرضی پر چھوڑ دوں تو وہ کسی انجانی تحریک کے زیرِ اثر خود بخود حرکت کرنے لگے گا اور میں اس حرکت میں کوئی دخل نہ دے سکوں گا۔ اگر میں اپنے جسم کی ہر وقت نگرانی نہ کروں اور بے خیالی میں اس پر توجہ نہ رکھوں تو وہ ایسے کام کرنے پر قادر ہے جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ احساس بہت عرصے سے مجھ میں پیدا ہو گیا تھا کہ میں جیتے جی گلنے لگا ہوں۔ نہ صرف میرا جسم بلکہ میری روح بھی ہمیشہ میرے دل سے برسرِ پیکار رہی ہے اور وہ

ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوے۔ میں ہمیشہ ایک گلنے اور بکھرنے کی سی حالت کو بسر کرتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی ایسی چیزوں کے خیالات ذہن میں آتے ہیں جنھیں میں خود باور نہیں کر سکتا۔ کبھی رحم کا احساس مجھ میں پیدا ہو جاتا ہے اور میری عقل مجھے اس پر سرزنش کرتی رہتی ہے۔ اکثر میں کسی سے باتیں کر رہا ہوتا ہوں یا کسی کام میں مشغول ہوتا ہوں تو اِدھر اُدھر کی چیزیں گفتگو میں داخل ہو جاتی ہیں جبکہ میرے حواس کہیں اور، کسی اور خیال میں ہوتے ہیں اور دل خود کو اس پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ میں بکھرتا اور گلتا ہوا ایک تودہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میں ہمیشہ سے ایسا تھا اور ایسا ہی رہوں گا — مختلف چیزوں کا ایک عجیب اور نامتناسب ملغوبہ۔

سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت یہ احساس ہے کہ میں جن لوگوں کو دیکھتا ہوں اور جن کے درمیان جیتا ہوں، ان سے دور ہوں؛ لیکن پھر بھی ایک ظاہری شباہت، ایک دھندلی سی شباہت جو مجھ سے دور بھی ہے اور میرے نزدیک بھی، ان سے مجھے جوڑے رکھتی ہے۔ یہ بات کہ میری اور ان کی احتیاجات ایک ہیں، تعجب سے مجھے مارے ڈالتی تھی۔ جو شباہت سب سے زیادہ مجھے عذاب دیتی تھی وہ یہ کہ وہ سفلے بھی میری طرح اس حرافہ، میری بیوی کی طرف کھنچتے تھے، اور وہ بھی ان کی طرف راغب ہوتی تھی۔ مجھے یقین ہے ہم میں سے کسی کے وجود میں ضرور کوئی نقص تھا۔

میں اسے حرافہ کہتا ہوں، کیونکہ کوئی اور نام اس پر اتنی اچھی طرح نہیں جچتا۔ میں اسے بیوی نہیں کہنا چاہتا کیونکہ بیوی اور شوہر کی خصوصیت ہمارے درمیان وجود نہیں رکھتی، اور اگر میں ایسا کہوں تو یہ خود سے جھوٹ بولنا ہوگا۔ میں روزِ ازل سے اسے حرافہ ہی کہتا ہوں، لیکن یہ نام ایک خاص طرح کی کشش رکھتا ہے۔ میں نے اسے بیوی بنایا تو اس لیے کہ پہلے وہ میری طرف آئی۔ یہ بھی اس کا مکر اور حیلہ تھا۔ نہیں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کیونکر کسی سے تعلق پیدا کر سکتی تھی؟ ایک ہوس باز عورت جسے ایک مرد شہوت رانی کے لیے، ایک عشق بازی کے لیے اور ایک شکنجے میں رکھنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ میرا یہ خیال نہیں کہ وہ صرف ان تین

پر اکتفا کرے گی۔ لیکن مجھے اس نے قطعی طور پر شکنجے میں رکھنے کے لیے چنا تھا، اور وہ اس سے بہتر انتخاب نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے اسے اس لیے چنا کہ وہ اپنی ماں کی شبیہ تھی اور مجھ سے ایک دھندلی اور دور کی شباہت رکھتی تھی۔ اب نہ صرف میں اس سے محبت کرتا تھا بلکہ میرے جسم کے ذرے ذرے کو اس کی طلب تھی — خاص طور پر میرے جسم کے درمیانی حصے کو۔ میں اصل احساسات کو عشق، تعلق اور غیر مرئی الٰہیات کے موہوم غلاف میں چھپانا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح کی لفظی الٹ پھیر سے میرے منھ کا مزہ خراب ہوتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک طرح کی روشنی یا ہالہ، جیسا ہالہ پیغمبروں کے سروں کے گرد ہوتا ہے، میرے جسم کے اندر روپوش ہے اور یہ دھیما اور بیمار ہالہ اس کے جسم کے ہالے کو چاہتا ہے اور پوری جان سے اس کی طرف کھنچتا ہے۔

جب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ارادہ کیا کہ کہیں جا کر خود کو گم کر دوں، جس طرح کوئی روگی کتا جسے اپنی آنے والی موت کا احساس ہو جاتا ہے، یا جس طرح پرندے اپنی موت کے وقت چھپ جاتے ہیں۔ میں صبح سویرے اٹھا، الماری کے سب سے اوپر والے خانے سے کلچے اٹھائے اور کسی کے خبر ہوئے بغیر گھر سے نکل گیا۔ میں نحوست سے بھاگ رہا تھا جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں بے پروا اور بے مقصد، گلیوں اور ان سفلوں کے درمیان سے گزرتا رہا جن کے چہروں پر طمع تھی اور جو پیسے اور شہوت کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو دیکھ لینا سب کو دیکھ لینے کے برابر تھا۔ ان میں سے ہر شخص ایک منھ تھا جس سے فوطے لٹک رہے تھے اور اس کا جسم ایک آلۂ تناسل پر ختم ہوتا تھا۔

ناگہاں مجھے محسوس ہوا کہ میں بہت زیادہ ہلکا اور پھرتیلا ہو گیا ہوں۔ میرے پیروں کے عضلات اس پھرتی اور تیزی سے مجھے لیے جا رہے تھے کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں زندگی کی ساری زنجیروں سے نکل آیا ہوں۔ میرے شانے اوپر کو اٹھے

ہوے تھے۔ یہ میرا فطری سبھاؤ تھا۔ میں بچپن میں جب بھی مشقت اور جوابدہی کے بوجھ سے آزاد ہوتا تو اسی طرح شانے اٹھا کر چلا کرتا تھا۔

سورج چڑھ آیا تھا اور اس کی تپش جلانے لگی تھی۔ میں سنسان گلیوں میں چلا جا رہا تھا۔ راستے میں میں نے خاکستری رنگ اور عجیب شکلوں کے مکعب، منشور اور مخروط مکان دیکھے۔ ان کی کھڑکیاں چھوٹی چھوٹی اور تاریک تھیں۔ یہ کھڑکیاں لگتا تھا کبھی نہیں کھلیں، یہاں کبھی کوئی نہیں رہا اور یہ سب محض لمحاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زندہ، موجود آدمی ان مکانوں میں نہیں رہ سکتا۔

سورج ایک سونے کی تلوار کی طرح، دیواروں کے سایوں کو کناروں سے کاٹ کر باہر آ رہا تھا۔ پرانے سفیدی کیے ہوے مکانوں کے درمیان گلیاں کھنچی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ ایک سکون اور خاموشی تھی جیسے سارے عناصر گرم ہوا کے مقدس قانون — قانونِ سکوت — کی پابندی کر رہے ہوں۔ ہر چیز بھیدوں سے بھری معلوم ہوتی تھی۔ میرے پھیپھڑوں کو سانس لینے کی جرأت نہ تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں باہر ہوں۔ تیز دھوپ کے ہزاروں دہن میرے جسم کی نمی چوس رہے تھے۔ تیز دھوپ میں صحرا کے پودے ہلدی کی طرح زرد لگ رہے تھے۔ ایک بخار آلود آنکھ کی طرح سورج اپنا جلتا ہوا سایہ آسمان کی اونچائیوں سے اس خاموش اور بے جان منظر پر ڈال رہا تھا۔ لیکن یہاں کی مٹی اور پودوں میں ایک خاص بو تھی۔ یہ بو اس قدر تیز تھی کہ میں اسے سونگھ کر بچپن کے لمحوں کی یاد میں پہنچ گیا۔ نہ صرف اس وقت کی چلت پھرت اور باتیں میرے ذہن میں مجسم ہو گئیں بلکہ میں نے ایک لمحے کے لیے اس زمانے کو اپنے اندر محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ ابھی کل کی بات ہو۔ مجھے ایک خوشگوار سی گھمیری محسوس ہوئی جیسے میں دوبارہ اس گم شدہ دنیا میں پیدا ہو گیا ہوں۔ اس احساس میں ایک مست کر دینے والی بات تھی اور یہ ایک پرانی شراب کی طرح میرے وجود کی گہرائیوں تک میرے رگ و پے میں اتر گیا۔

میں نے صحرا میں کانٹوں، پتھروں، درخت کے تنوں اور صحرائی بیلوں کو اور سبزے کی مخصوص بو کو پہچانا۔ دور دراز زمانوں کی یادیں جاگ اٹھیں، لیکن یہ ساری یادیں، مجھ سے دور اور الگ، اپنا علیحدہ وجود رکھتی تھیں اور میں جیسے دور کھڑا بے بسی سے دیکھ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اور یادوں کے درمیان ایک گہرا گرداب آ گیا ہے۔ مجھے لگا کہ میرا دل آج خالی ہو گیا اور پودے اس زمانے کی جادوئی خوشبو گم کر چکے ہیں۔ سرو کے درختوں کا جھنڈ چھدرا ہو گیا تھا اور پہاڑیاں اور خشک ہو گئی تھیں۔ جو شخص میں اُس وقت ہوا کرتا تھا اس کا اب وجود نہ تھا، اور اگر اب میں اسے کہیں سے لے آتا اور اس سے بات کرتا تو وہ نہ میری بات سن سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس سے کسی زمانے میں میری شناسائی رہ چکی تھی لیکن وہ مجھ سے نہیں تھا اور میرا حصہ نہیں تھا۔

دنیا مجھے ایک خالی اور غمناک مکان معلوم ہو رہی تھی اور سینے میں ایک بے چینی چکر کھا رہی تھی جیسے میں اب ننگے پاؤں اس مکان کے ویران کمروں میں پھرتے رہنے پر مجبور ہوں۔ میں سب کمروں سے گزرتا ہوا جب آخری کمرے میں اس حرافہ تک پہنچتا ہوں تو میرے پیچھے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں اور صرف مٹے ہوئے زاویوں والی دیواروں کے لرزتے ہوئے سائے میرے اردگرد سیاہ فام غلاموں کی طرح پہرہ دیتے ہیں۔

جب میں نہر سورن پر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے ایک خشک اور پتھریلا پہاڑ ہے۔ پہاڑ کا خشک اور سخت جثہ دیکھ کر مجھے اپنی آیا یاد آ گئی — پتا نہیں دونوں میں کیا ربط تھا۔ پہاڑ کے کنارے چلتے چلتے میں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے احاطے میں جا پہنچا تھا جو چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ زمین نیلوفر کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور پہاڑ پر وزنی اینٹوں سے بنا ہوا ایک اونچا قلعہ نظر آتا تھا۔ پھر مجھے تھکن کا احساس ہوا اور میں نہر سورن کے کنارے سرو کے ایک قدیم درخت کے سائے میں ریت پر بیٹھ گیا۔

یہ ایک تنہا اور پرسکون جگہ تھی۔ لگتا تھا کسی نے آج تک یہاں قدم نہیں رکھا۔ ناگہاں

میں نے چونک کر دیکھا کہ سرو کے درختوں کے پیچھے سے نکل کر ایک چھوٹی سی لڑکی قلعے کی طرف جارہی ہے۔ اس کا سیاہ لباس بہت نازک اور سبک تانے بانے کا، گویا ابریشم سے بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کا ناخن چبا رہی تھی اور آزاد بے پروا انداز سے گرتی سنبھلتی چلی جارہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے دیکھ رکھا ہے اور شاید میں اسے پہچان رہا تھا، لیکن فاصلے اور دھوپ کی وجہ سے وہ پہچان میں نہیں آئی اور پھر اچانک اوجھل ہوگئی۔

میں اپنی جگہ پر پتھر کا سا ہوگیا اور ذرا بھی ہلنے جلنے کے قابل نہ رہا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ سامنے آئی اور غائب ہوگئی۔ کیا وہ کوئی حقیقی وجود تھی یا واہمہ؟ میں جاگ رہا تھا یا خواب دیکھ رہا تھا؟ اسے یاد میں لانے کی میری ساری کوشش بیکار تھی۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک لرزہ سا محسوس ہوا۔ لگتا تھا جیسے پہاڑ والے قلعے کی ساری روحوں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ لڑکی رے کے قدیم شہر کے باسیوں میں سے تھی۔

میرے سامنے جو منظر تھا وہ مجھے جانا پہچانا سا معلوم ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ بچپن میں چاند کی تیرھویں کو میں اپنی بیوی کی ماں اور اس حرافہ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس روز ہم سرو کے ان درختوں کے پیچھے کتنا دوڑتے اور کھیلتے رہے تھے۔ پھر کچھ اور بچے بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ یاد نہیں وہ کون تھے۔ ہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک بار میں نہر سورن کے کنارے اس حرافہ کے پیچھے جو بھاگا تو اس کا پیر پھسل گیا اور وہ نہر میں جا پڑی۔ اسے باہر نکالا گیا اور سرو کے درخت کی اوٹ میں اس کے کپڑے بدلوائے گئے۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ اس کے سامنے نماز کی چادر تان دی گئی تھی لیکن میں نے چوری چھپے درخت کے پیچھے سے اس کے پورے جسم کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ کا ناخن چبا رہی تھی۔ پھر ایک سفید چادر اس کے جسم پر لپیٹ دی گئی اور اس کے نازک تانے بانے والے سیاہ ابریشمی لباس کو دھوپ میں سوکھنے کے لیے پھیلا دیا گیا۔

آخر میں سرو کے پرانے درخت کے قدموں میں لیٹ گیا۔ پانی کے بہنے کی آواز خواب کے ٹوٹے پھوٹے بے مفہوم لفظوں کی گنگناہٹ کی طرح کان میں آ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار گرم اور نمناک ریت میں ہاتھ دھنسا دیے اور ریت کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ بالکل اس لڑکی کے بدن کے گوشت کی طرح دبیز تھی جو پانی میں جا پڑی تھی اور بعد میں جس کے کپڑے بدلوائے گئے تھے۔

معلوم نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بے ارادہ چلنے لگا۔ ہر طرف خاموشی اور سکوت تھا۔ میں اپنے اردگرد نظر ڈالے بغیر چلا جا رہا تھا۔ میرے ارادے سے باہر کوئی قوت مجھے چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرے سارے حواس میرے قدموں پر مرکوز تھے۔ میں چل نہیں رہا تھا بلکہ اس سیاہ لباس والی لڑکی کی طرح گر اور سنبھل رہا تھا۔ جب میں اپنے آپ میں آیا تو خود کو شہر میں اپنی بیوی کے باپ کے گھر کے سامنے پایا۔ معلوم نہیں کس لیے میں نے اس کے گھر کی راہ اختیار کر لی تھی۔ ایک چھوٹا سا لڑکا، میری بیوی کا بھائی، باہر چبوترے پر بیٹھا تھا۔ وہ اور اس کی بہن سیب کے دو آدھے آدھے ٹکڑے تھے؟ ہرن کی سی ترکمانی آنکھیں، رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں، گیہواں رنگ، حساس نتھنے اور ستا ہوا دبلا چہرہ۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی انگلی منہ میں لے رکھی تھی۔ میں بے اختیار اس کے پاس چلا گیا اور اپنی جیب سے کلچے نکال کر اسے دیے اور اس سے کہا، ''یہ تمھارے لیے شاہ جان نے بھیجے ہیں۔'' وہ میری بیوی کو شاہ جان (ماں) کہا کرتا تھا۔ اس نے کلچوں پر بھیگی ہوئی آنکھوں سے حیرت بھری نظر ڈالی۔ میں نے چبوترے پر بیٹھ کر اسے بغل میں لے لیا اور اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کا جسم گرم اور پنڈلیاں بالکل میری بیوی کی طرح تھیں اور اس کا بے پروا انداز بھی اسی جیسا تھا۔ اس کے ہونٹ اس کے باپ پر تھے لیکن جو کچھ مجھے اس کے باپ سے متنفر کرتا تھا، وہی اس کی طرف کھینچتا اور مائل کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اَدھ کھلے ہونٹ ایک طویل اور گرم بوسے کے بعد ابھی ابھی جدا ہوئے ہوں۔ میں نے اس کے

ادھ کھلے منھ کو چوما جو بالکل میری بیوی کے ہونٹوں کی طرح تھا۔ اس کا ذائقہ ککڑی کے ڈنٹھل کی طرح تلخ اور کسیلا تھا— یقیناً اس حرافہ کے ہونٹوں کا مزہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

تب ہی میں نے اس کے باپ کو خمیدہ پشت اور گردن پر لپٹی شال کے ساتھ گھر سے باہر آتے دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر گزر گیا۔ وہ کھرکھراتی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں ہنس رہا تھا اور ہنسی کے زور سے اس کے کندھے لرز رہے تھے۔ میں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا جیسے خود سے بھاگ جانا چاہتا ہوں، اور پھر بے ارادہ گھر کے راستے پر چل دیا۔ کہیں دور دور تک کوئی جاندار نظر نہ آتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک عجیب اور ان جانے شہر میں چل پھر رہا ہوں۔ عجیب شکلوں والے الگ الگ بنے ہوئے مکان میرے اردگرد تھے۔ ان کی کھڑکیاں بے آباد اور تاریک تھیں اور لگتا تھا کہ وہ کبھی کسی زندہ شخص کا مسکن نہیں رہے۔ ان مکانوں کی دیواریں کسی بیماری روشنی سے دمک رہی تھیں۔ ایک عجیب اور یقین میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ میں جس دیوار کے سامنے سے گزرتا، اس پر چاندنی میں میرا بہت گہرا سایہ پڑتا لیکن وہ سر کے بغیر تھا۔ میرے سائے کا سر نہ تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اگر کسی کا سایہ بغیر سر کے ہو تو وہ اسی سال مر جاتا ہے۔

میں سراسیمہ اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں پناہ لی۔ تب اچانک میری ناک سے خون جاری ہو گیا اور بہت خون بہہ جانے کے بعد میں اپنے بستر پر گر پڑا۔ آیا میری دیکھ بھال کرنے لگی۔

آنکھ لگنے سے پہلے میں نے آئینے میں خود پر نظر ڈالی۔ میرا چہرہ شکستہ، مٹا ہوا اور بے روح ہو گیا تھا، اتنا مٹ چکا تھا کہ میں خود کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ میں نے بستر میں گھس کر سر پر رضائی کھینچ لی اور منھ دیوار کی طرف کر لیا۔ پیر سمیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خیالات کی رو میں بہنے لگا۔ یہ جال میری تاریک، غم انگیز، مہیب اور پُرکیف تقدیر نے میرے اردگرد بُن رکھا تھا، جہاں زندگی موت میں گھلنے لگتی ہے اور مٹی ہوئی تقدیریں پھر سے جاگ اٹھتی

ہیں، بہت دنوں کی مرچکی خواہشیں اور گھٹی ہوئی آرزوئیں پھر سے جی اٹھتی ہیں اور انتقام کے لیے پکارتی ہیں۔ اس وقت میں فطرت اور ظاہری دنیا سے کٹ گیا اور ایک ازلی بہاؤ میں گم ہو کر نابود ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ کئی بار میں نے خود سے سرگوشی میں کہا، ''موت، موت — تو کہاں ہے؟'' اس سے مجھے تسکین سی ہوئی اور آنکھیں مند گئیں۔

آنکھیں بند ہوتے ہی میں نے خود کو چوک محمدیہ میں پایا۔ وہاں ایک اونچی سی صلیب نصب تھی اور وہ بوڑھا بساطی جو میرے کمرے کے سامنے بیٹھتا تھا، اس پر لٹکا ہوا تھا۔ نشے میں دُھت کچھ سپاہی اس کے نیچے شراب پی رہے تھے۔ میری بیوی کی ماں سخت ہیجان کے عالم میں، جس میں اب میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہوں جب وہ تلخی میں ہوتی ہے — ہونٹوں کا رنگ اُڑا ہوا اور آنکھیں گول، وحشت زدہ — مجھے بازو سے پکڑے بھیڑ میں سے لیے جا رہی تھی۔ صلیب کے پاس پہنچ کر وہ جلاد سے بولی، ''اسے بھی لٹکا دو!'' میں ہراساں ہو کر خواب سے چونک پڑا۔ میں بھٹی کی طرح دہک رہا تھا۔ جسم پسینے میں تر اور رخسار بخار سے جل رہے تھے۔ اس کابوس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پانی پیا اور سر اور منھ پر چھینٹے دیے۔ پھر دوبارہ لیٹ گیا لیکن نیند نہ آئی۔

ہلکے ہلکے اندھیرے میں میری نظریں الماری کے اوپر رکھے پانی کے کوزے پر جم گئی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ جب تک یہ کوزہ الماری کے اوپر رکھا ہے، مجھے نیند نہیں آئے گی۔ ایک بے جا خوف ہونے لگا کہ کوزہ گر پڑے گا۔ اٹھا کہ کوزے کو محفوظ جگہ پر رکھ دوں، لیکن ایک عجیب بے ارادہ تحریک سے میرا ہاتھ کوزے سے ٹکرایا اور وہ گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آخر میں نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آیا جاگ اٹھی ہے، وہ مجھے دیکھ رہی ہو گی۔ میں نے پھر لحاف میں گھس کر مٹھیاں بھینچ لیں، لیکن کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ غنودگی میں گلی کی آوازیں میرے کان میں آ رہی تھیں۔ پھر میں نے آیا کے قدموں کی آہٹ سنی جو زمین پر جوتیاں گھسیٹتی نان اور پنیر لینے جا رہی تھی۔

پھر دور سے کسی سودا بیچنے والے کی آواز سنائی دی: ''صفرا کے لیے شہتوت!'' نہیں، ایک تھکا دینے والے معمول کی طرح زندگی پھر شروع ہو چکی تھی۔ روشنی پھیل گئی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو باہر حوض سے منعکس ہو کر ایک دھوپ کا ٹکڑا کھڑکی کے راستے کمرے کی چھت پر لرز رہا تھا۔

گزشتہ رات کا خواب مجھے اتنا دور اور اتنا مٹا مٹا سا لگ رہا تھا جیسے بہت پہلے کبھی بچپن میں دیکھا ہو۔ آیا میرے لیے ناشتہ لے کر آئی۔ اس کا چہرہ کسی بگڑے ہوئے آئینے میں دکھائی دینے والے عکس کی طرح پتلا، کھنچا ہوا اور باور نہ آنے کی حد تک مضحک معلوم ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کسی بھاری بوجھ کے زور سے اس کا چہرہ پیچھے کو ہوا جا رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ آیا کو معلوم تھا کہ حقے کا دھواں میرے لیے بُرا ہے، وہ میرے کمرے میں حقہ پیتی تھی۔ دراصل حقہ پیے بغیر وہ اپنے آپ میں نہیں آتی تھی۔ اپنے گھر اور اپنی بہو کے بارے میں باتیں کر کے وہ مجھے اپنی ذاتی مسرتوں میں شریک کر لیا کرتی تھی۔ کس قدر احمقانہ بات تھی کہ کبھی کبھی تو میں اس کے گھر والوں کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں دوسروں کی زندگی کی خوشیاں مجھے متنفر کرتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میری زندگی ختم ہو چکی ہے اور دردناک آہستگی سے گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ میں احمقوں اور سفلوں کی زندگی کے بارے میں سوچوں! ان لوگوں کے بارے میں جو صحیح سالم ہیں، خوب کھاتے ہیں، خوب سوتے ہیں اور خوب جفتی کرتے ہیں، اور جو میرے درد کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں کر سکتے، اور جن کے سروں اور چہروں پر ہر لمحے موت کے پروں کا سایہ نہیں منڈلاتا۔

آیا مجھ سے بچوں کا سا برتاؤ کرتی تھی اور مجھے پوری طرح جاننا چاہتی تھی۔ میں ابھی تک اپنی بیوی سے جھینپتا رہتا تھا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلفچی میں پڑے اپنے تھوک کو ڈھانپ دیتا اور سر اور داڑھی کے بال سنوار کر رات کی ٹوپی سر پر جما لیتا تھا۔ لیکن آیا

کے سامنے مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔ اس عورت نے جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ جانے کس طرح میری زندگی میں خود کو اس قدر داخل کر لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جاڑوں میں اس کمرے میں گرم کرسی ڈال دی جاتی تھی اور میں اور آیا اور وہ حرافہ اس کے گرد سویا کرتے تھے۔ دھندلی سی تاریکی میں جب میری آنکھ کھلتی تو دروازے پر لٹکے زردوزی کے پردے میں جیسے جان پڑ جاتی۔ کیسا عجیب اور ڈراؤنا پردہ تھا۔ اس پر ہندوستانی جوگیوں سے ملتا جلتا ایک خمیدہ پشت بوڑھا پگڑی باندھے سرو کے درخت کے نیچے ستار جیسا کوئی ساز لیے بیٹھا تھا اور ایک نوجوان لڑکی، جو ہندوستان کے کسی مندر کی رقاصہ بیگم داسی کی طرح تھی، ہاتھ باندھے اس کے سامنے یوں ناچ رہی تھی جیسے ناچنے پر مجبور ہو۔ مجھے خیال آتا تھا کہ شاید اس بوڑھے کو بھی کسی ناگ کے ساتھ اندھیرے غار میں ڈال دیا گیا تھا، اور وہ اس حالت میں باہر نکلا تھا کہ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔

وہ پردہ زردوزی کے ان پردوں میں سے تھا جو شاید میرے باپ یا چچا نے کسی دور دراز کے ملک سے بھیجے تھے۔ میں اسے جتنا غور سے دیکھتا اتنا ہی ڈرتا۔ میں آیا کو جگاتا اور وہ مجھے اپنے بدبودار سانسوں اور میرے چہرے پر بکھرے اپنے سیاہ کھردرے بالوں کے ساتھ مجھے خود سے چمٹا لیتی۔ صبح جب میری آنکھ کھلتی، وہ اسی حالت میں میرے سامنے ہوتی، صرف اس کے خدوخال اور زیادہ گہرے اور سخت ہو چکے ہوتے۔

غالباً فراموشی اور خود سے بھاگنے کی غرض سے میں اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کیا کرتا ہوں، تاکہ خود کو بیماری سے پہلے کی حالت میں محسوس کر سکوں، تاکہ مجھے یوں لگے کہ میں ابھی تک ٹوٹا پھوٹا نہیں۔ مجھے اب تک محسوس ہوتا ہے کہ میں بچہ ہوں اور مجھ میں ایک اور شخص ہے جو میری موت پر، میرے فنا ہو جانے پر افسوس کر رہا ہے — اس بچے کے حال پر جو مر جائے گا۔ اپنی زندگی کے ڈراؤنے موقعوں پر جب بھی میں اپنی آیا کے پرسکون چہرے کو دیکھتا ہوں — پھیکی رنگت، گہری، بے حرکت اور گدلی آنکھیں، پتلے نتھنے اور اونچی

ہڈیالی پیشانی — اسے دیکھ کر اُس زمانے کی یادیں مجھ میں بیدار ہو جاتی ہیں۔ شاید اس میں سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو مجھے تسکین دیتی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک مسّہ ہے جس پر اِکّا دُکا بال اُگ آئے ہیں۔ میں نے اسے اسی روز محسوس کیا، شاید پہلے میں نے اسے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔

اگرچہ آیا میں ظاہری تبدیلی آ گئی تھی، اس کے خیالات ویسے ہی تھے، سوائے اس کے کہ اب وہ زندگی میں اور زیادہ دلچسپی ظاہر کرتی تھی اور موت سے اور زیادہ ڈرنے لگی تھی، جس طرح مکھیاں خزاں شروع ہوتے ہی کسی چھت کے نیچے پناہ لیتی ہیں۔ جبکہ میری زندگی ہر روز اور ہر لمحے بدلتی رہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وقت کی گزران اور تبدیلی جو دوسروں کے لیے کئی سال میں ہو پاتی، میرے لیے اس کا بہاؤ ہزار گنا تیز تھا، جبکہ خوشی اسی رفتار سے صفر کی طرف جا رہی تھی بلکہ صفر سے بھی اُدھر نکل گئی تھی۔ کچھ لوگ بیس برس کی عمر سے مرنا شروع کر دیتے ہیں اور اکثر لوگ تیل ختم ہو جانے والے چراغ کی طرح آہستگی اور سکون سے اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔

دوپہر کو جب آیا میرے لیے کھانا لے کر آئی تو میں نے شوربے کا پیالہ الٹ دیا اور چلّانے لگا۔ میں پورے زور سے چیخ رہا تھا۔ سب گھر والے میرے کمرے کے سامنے جمع ہو گئے۔ وہ حرافہ بھی آئی اور جلد ہی لوٹ گئی۔ میں نے اس کا اُبھرا ہوا پیٹ دیکھا۔ نہیں، بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جا کر حکیم باشی کو خبر کی۔ میں اندر ہی اندر مزہ لے رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں نے ان احمقوں کو تنگ کیا۔

حکیم باشی اپنی تین بالشت لمبی داڑھی کے ساتھ آیا اور میرے لیے افیون تجویز کی۔ میری دردناک زندگی کے لیے یہ کیسی گراں بہا دارو تھی! جب میں افیون کھاتا ہوں تو میرے خیالات پر شکوہ، لطیف، طلسمی اور بلند ہو جاتے ہیں اور میں اس دنیا سے ماورا ایک اور ہی محیط میں سیر کرنے لگتا ہوں۔

میری فکریں اور خیالات کشش ثقل اور زمینی چیزوں کے وزن سے آزاد ہو گئے اور میں پرسکون اور خاموش آسمان کی طرف اڑنے لگا جیسے مجھے کسی سنہری چمگادڑ کے پروں پر رکھ دیا گیا ہو اور میں ایک خالی اور چمکیلی دنیا میں سیر کر رہا ہوں اور کوئی چیز میرے راستے میں نہیں آئی۔ اس کا کیف موت کے کیف سے بھی گہرا اور پُر اثر تھا۔

جب میں چلم کے پاس سے اٹھا تو احاطے میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دیکھا، آیا دھوپ میں بیٹھی سبزیاں صاف کر رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی بہو سے کہتے سنا، ''اس کے لیے ہم سب کا دل کڑھتا ہے۔ خدا اسے اس تکلیف سے نجات دے۔'' یعنی حکیم باشی نے انھیں بتا دیا تھا کہ میں ٹھیک ہونے والا نہیں۔

لیکن مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ لوگ کس قدر احمق ہیں! جب ایک گھنٹے بعد وہ میرے لیے جوشاندہ لے کر آئی تو اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ میرے سامنے مسکرا رہی تھی۔ وہ سب میرے سامنے ناٹک کرتے تھے اور وہ بھی کس بھونڈے پن سے! کیا ان کے خیال میں میں نہیں سمجھتا؟ لیکن یہ عورت کیوں مجھ سے اس قدر تعلق جتاتی ہے؟ کیوں خود کو میرے درد میں شریک جانتی ہے؟ بس اتنا ہی تو تھا کہ اسے پیسے دیے گئے تھے اور اس نے اپنے سیاہ، جھریوں پڑے پستان مشکیزوں کی طرح میرے ہونٹوں میں گھسیڑ دیے تھے۔ ان پستانوں میں کیڑے پڑیں! اب ان پستانوں کو دیکھ کر مجھے ابکائی آتی ہے کہ اس وقت میں اتنی بیتابی سے ان کا شیرۂ زندگی چوسا کرتا تھا اور ہم دونوں کے جسموں کی گرمی ایک دوسرے میں گھل جاتی تھی۔ وہ میرے پورے بدن کی صفائی کیا کرتی تھی اور اسی لیے اب بھی وہ ایسی بے حجابی سے مجھ سے برتاؤ کرتی تھی جو صرف بیواؤں سے ممکن ہے۔ وہ مجھے وہی بچہ سمجھتی ہے جسے وہ پاخانے لے جایا کرتی تھی۔ کون جانے، شاید وہ مجھ سے اپنی جنسی خواہش بھی پوری کرتی رہی ہو جیسے عورتیں اپنی منہ بولی بہنوں کے ساتھ کرتی ہیں۔

اب بھی وہ کتنی محنت اور دقت سے میرا سارا کام — اپنے الفاظ میں تر وخشک — کیا کرتی تھی۔ اگر اپنی بیوی، اس حرافہ، تک میری پہنچ ہوتی تو میں اس آیا کو قریب بھی نہ آنے دیتا۔ میرے خیال میں میری بیوی کا دائرۂ فکر اور حسِ زیبائی آیا سے زیادہ تھی، یا یہ کہ فقط شہوت نے مجھ میں یہ جھینپ پیدا کر دی تھی۔

اس طرح میں صرف آیا سے بے تکلف تھا اور اسی تک میری پہنچ تھی۔ اس کا اعتقاد یقیناً یہی ہوگا کہ تقدیر یہی تھی، اس کا ستارہ یہی کہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میری بیماری سے فائدہ اٹھا کر اپنے سارے خاندانی دکھ اور جھگڑے مجھے سنایا کرتی اور اپنی سادہ اور موذی اور فقیرانہ روح کو مجھ پر ظاہر کیا کرتی۔ اسے اپنی بہو سے اتنی شکایت تھی جیسے وہ اس کی سوکن ہو جس نے اس کے بیٹے کا ایک حصہ چرا لیا ہو۔ کتنے کینے سے وہ اس کا تذکرہ کرتی تھی! اس کی بہو ضرور خوش شکل ہوگی۔ میں نے احاطے والی کھڑکی سے اسے دیکھا ہے، اس کی آنکھیں اور بال بھورے اور ناک چھوٹی سی اور ستواں ہے۔

آیا کبھی کبھی مجھے پیغمبروں کے معجزے سنایا کرتی تھی۔ اپنی دانست میں اس طرح وہ مجھے تسلی دینا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی پست خیالی اور حماقت پر رشک آتا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی، مثلاً کچھ روز پہلے وہ مجھ سے کہنے لگی کہ بیٹی نے (یعنی اس حرافہ نے) اپنے بچے کے لیے اچھی ساعت میں بہت اچھا لباس سیا ہے۔ اس کے بعد وہ یوں میری دلداری کرنے لگی جیسے اسے بھی معلوم ہو۔ کبھی وہ پڑوسیوں سے میرے لیے گھریلو ٹوٹکے کی دوائیں لاتی، کبھی کسی جادوگر، کسی فال گیر یا کسی جام زن کے پاس جاتی، کتاب کھولتی اور ان سے میرے بارے میں مشورہ کرتی۔ سال کے آخری چہار شنبے کو وہ میرے لیے ایک فال گیر سے ایک کاسہ لائی جس میں پیاز، چاول اور سڑا ہوا تیل تھا۔ کہنے لگی کہ یہ سب چیزیں وہ میری تندرستی کے لیے مانگ کر لائی ہے۔ پھر یہ سب گند اور الا بلا مجھے بتائے بغیر تھوڑا تھوڑا کر کے کھلاتی رہی۔ وقفے وقفے سے وہ مجھے حکیم باشی کے دیے ہوئے جوشاندے بھی نگلواتی رہی۔

وہی سب بے سروپا دوائیں جو میرے لیے تجویز کی گئی تھیں: پرزوفا، پرسیاوشان، رب سوس، کافور، بابونہ، روغن غاز، تخم کتان، تخم صنوبر، نشاستہ، خاکہ شیر اور ایسی ہی دوسری خرافات۔

کچھ روز پہلے وہ میرے لیے ایک دعاؤں کی کتاب لائی جس پر ایک انگل گرد جمی ہوئی تھی۔ نہ صرف دعاؤں کی کتاب بلکہ سفلوں کی کسی قسم کی کتابوں کو، ان کے نوشتوں اور خیالوں کو میرے درد سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مجھے ان کے جھوٹ اور ڈھونگ کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں خود پچھلی نسلوں کے تعلقات کا نتیجہ نہیں تھا اور ان کے تجربات مجھ میں باقی نہیں تھے؟ کیا گزرا ہوا وقت مجھ میں موجود نہیں تھا؟ لیکن اس کے باوجود مسجد، اذان، وضو، کلیاں اور ایک ایسے قادرِ مطلق کے سامنے جھکنا اور کھڑے ہونا جس سے صرف عربی میں خطاب کیا جا سکتا تھا، ان سب کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

اگرچہ اس سے پہلے جب میں ٹھیک ٹھاک تھا تو کئی مرتبہ مسجد جا چکا تھا اور کوشش کی تھی کہ اپنے دل کو دوسرے لوگوں کا سا کر لوں، لیکن میری نظریں چمکیلے کاشیوں اور مسجد کی دیواروں پر بنے نقش و نگار پر جمی رہتیں جو مجھے سہانے خوابوں میں لے جاتے اور اس طرح مجھے فرار کی راہ مل جاتی۔ دعا کے وقت میں آنکھیں بند کر کے چہرے تک ہاتھ اٹھا لیتا اور اپنی ایجاد کی ہوئی اس رات میں خواب میں دہرائے گئے بے معنی الفاظ کی طرح دعا پڑھتا رہتا؛ لیکن یہ الفاظ میرے دل سے نہ نکلتے تھے کیونکہ قادرِ مطلق سے بات کرنے کی نسبت مجھے کسی دوست یا آشنا سے باتیں کرنا زیادہ بہتر لگتا تھا، کیونکہ وہ مجھ سے بہت زیادہ اونچا تھا۔

جس زمانے میں میں اپنے گرم اور نمناک بستر پر پڑا سوتا تھا، یہ مسائل میرے لیے جو برابر بھی اہمیت نہ رکھتے تھے اور تب میں یہ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ آیا خدا کا واقعی وجود ہے یا وہ محض زمینی حکمرانوں کی شبیہ ہے جسے انھوں نے مقامِ الوہیت کی حفاظت یا رعایا کو دبائے رکھنے کے لیے خود ہی گھڑ لیا ہے اور زمینی تصویر کو آسمان پر منعکس کر دیا ہے۔ تب میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ رات صبح تک پہنچے گی یا نہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مذہب، ایمان، اعتقاد،

موت کے مقابلے میں کتنے چھوٹے اور بچگانہ ہیں، اور محض تندرست اور خوش بخت لوگوں کی تفریح کی چیزیں — موت کی وحشت ناک حقیقت اور میرے جان لیوا حالات اور موت کے خوف کے مقابلے میں وہ سب کچھ جو روح کی جزا و سزا اور روزِ حشر کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا، ذرا بھی اثر نہیں رکھتا تھا۔

نہیں، موت کا خوف میرا گریبان نہیں چھوڑتا۔ جن لوگوں کو اس درد سے واسطہ نہیں پڑا وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ مجھ میں زندگی کی حس اتنی بڑھ گئی کہ خوشی کا صرف ایک لمحہ میرے لیے کرب اور اضطراب کے طویل گھنٹوں کا بدل تھا۔

میں نے دیکھا کہ درد اور غم کا وجود ہے، لیکن کسی معنی و مفہوم سے خالی۔ میں سفلوں کے درمیان ایک اجنبی اور ناشناس شخص ہو گیا اور انھیں یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی میں ان کی دنیا کا حصہ رہ چکا ہوں۔ وحشت ناک بات یہ تھی کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ نہ تو میں پوری طرح زندہ ہوں نہ پوری طرح مردہ، بلکہ صرف ایک چلتی پھرتی لاش ہوں جس کا تعلق نہ زندوں کی دنیا سے ہے اور نہ موت کا سکون اور فراموشی اسے حاصل ہے۔

رات کے وقت جب میں افیون کی چلم کے پاس سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکا تو قصاب کی بند دکان کے پہلو میں ایک سیاہ درخت کھڑا تھا۔ تاریک سائے بکھرے اور الجھے ہوئے تھے۔ مجھے ہر چیز خالی اور وقتی محسوس ہو رہی تھی۔ رال کے دھویں جیسا آسمان ایک پرانی سیاہ چادر کی طرح تھا، اور چمکدار ستارے اس میں سوراخوں کے مانند تھے۔ تب ہی اذان کی آواز سنائی دی — یہ بے وقت کی اذان تھی، گویا کوئی عورت، شاید وہی حرافہ، بچہ جنتے ہوئے درد سے چلّا رہی تھی۔ ایک کتے کے رونے کی آواز بھی اذان سے الجھی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا اگر یہ درست ہے کہ آسمان میں ہر شخص کا ایک ستارہ ہے تو میرا ستارہ ضرور بہت دور، تاریک اور بے معنی ہوگا، بلکہ شاید میرا کوئی ستارہ ہوگا ہی نہیں۔

اسی وقت نشے میں دُھت سپاہیوں کے دستے کی آواز گلی میں اُبھری جو وہاں سے

گزرتے ہوئے ایک دوسرے سے چھچھورے مذاق کر رہے تھے۔ پھر وہ تالیاں بجا بجا کر گانے لگے:

چلو کہ چل کے مے پییں
شرابِ ملکِ رے پییں

میں ہراساں ہو کر وہاں سے ہٹ آیا۔ ان کی آواز گونجتے گونجتے دور ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ نہیں، انھیں مجھ سے کوئی کام نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتے... پھر خاموشی اور اندھیرے کا ہر طرف راج ہو گیا۔ میں نے کمرے کا چراغ نہیں جلایا تھا۔ مجھے اندھیرے میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اندھیرا، وہ گاڑھا سیال جو ہر جگہ اور ہر چیز میں رس رس کر پہنچ جاتا ہے، میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اندھیرے ہی میں میرے گمشدہ خیالات، بھولے ہوئے خوف، یقین میں نہ آنے والے مہیب افکار جو میرے ذہن کے نہ جانے کون سے گوشے میں چھپے ہوتے تھے، پھر سے زندہ ہو جاتے، چلتے پھرتے اور میرا منھ چڑاتے۔ کمرے کے کونے، اور پردوں کے پیچھے اور دروازوں کے پاس، ہر جگہ ان بے شکل اور دھمکاتے ہوئے ہیولوں اور خیالات سے بھری ہوئی تھی۔

پردے کے پاس ایک ڈراؤنا ہیولا بیٹھا تھا۔ وہ بالکل ساکن تھا؛ نہ خوش معلوم ہوتا تھا نہ غمگین۔ ہر دفعہ جب میں لوٹتا، وہ میری آنکھوں میں گھور رہا ہوتا تھا۔ مجھے اس کی شکل آشنا لگ رہی تھی جیسے میں نے اسے کہیں بچپن میں دیکھا ہو۔ ایک مرتبہ چاند کی تیرھویں کو نہر سورن کے کنارے دوسرے بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے میں نے یہ شکل دیکھی تھی۔ یہ دوسرے پستہ قد مضحکہ خیز اور ڈراؤنے ہیولوں میں گھری مجھ پر ظاہر ہوئی تھی۔ یہ میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے والے قصاب کی سی صورت تھی۔ جیسے اس شخص کو میری زندگی میں دخل حاصل تھا اور میں نے اسے بہت دیکھ رکھا تھا۔ جیسے یہ سایہ میرا ہمزاد تھا اور میری ہی زندگی کے محدود دائرے میں واقع ہوا تھا۔

جب میں چراغ جلانے کے لیے اٹھا تو یہ سایہ خود بخود گھل کر معدوم ہو گیا۔ میں نے آئینے میں اپنی شکل غور سے دیکھی۔ جو انجانی تصویر مجھے نظر آئی وہ ناقابل یقین اور ڈراؤنی تھی۔ میرا عکس مجھ سے زیادہ قوی ہو گیا تھا اور میں آئینے پر ایک تصویر بن گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی تصویر کے ساتھ تنہا ایک کمرے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نکل بھاگا تو یہ میرا پیچھا کرے گی — دو لڑتی ہوئی بلیوں کی طرح جو لڑتے لڑتے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ جائیں۔ پھر بھی میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تا کہ اپنی ہتھیلیوں سے ایک نہ ختم ہونے والی رات پیدا کر لوں۔ غالباً وحشت کی یہ حالت میرے لیے ایک خاص کیف اور مستی رکھتی تھی کہ میرا سر گھومنے لگا اور رانیں ڈھیلی پڑ گئیں اور قے آنے لگی۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں۔ یہ مسئلہ میرے لیے عجیب تھا، معجزاتی تھا۔ آخر میں کیونکر اپنے پیروں پر کھڑا رہ گیا تھا؟ مجھے لگا کہ اگر میں نے اپنی ایک ٹانگ کو بھی جنبش دینے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر گر پڑوں گا۔ میں ایک عجیب گھمیری کی کیفیت میں تھا۔ زمین اور اس کی چیزیں مجھ سے بے اندازہ دور ہو گئی تھیں۔ میرے دل میں مبہم سی خواہش اُبھری کہ کوئی زلزلہ آئے یا بجلی گرے تا کہ میں دوبارہ سکون اور روشنی کی دنیا میں جنم لوں۔

جب میں بستر پر جانے لگا تو کئی بار خود سے کہا، ''موت... موت...'' میرے ہونٹ بند تھے لیکن میں اپنی آواز سے ڈر رہا تھا۔ میری جرأت مجھ سے بالکل رخصت ہو چکی تھی۔ میں ان مکھیوں کی طرح ہو گیا تھا جو خزاں شروع ہوتے ہی کمروں میں گھس آتی ہیں — خشک اور بے جان مکھیاں جو اپنے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ڈر کر دیوار سے چپک جاتی ہیں اور جب انھیں اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے تحاشا خود کو در و دیوار سے ٹکرا دیتی ہیں اور ان کی لاشیں کمرے میں چاروں طرف بکھر جاتی ہیں۔

جب میری پلکیں بند ہوئیں تو ایک دھندلی سی دنیا میرے سامنے نقش پذیر ہونے لگی۔ ایک دنیا جس کی ہر چیز میری ایجاد کی ہوئی تھی اور میرے خیالوں اور مشاہدوں کے عین مطابق

تھی۔ وہ ہر صورت میں میری بیداری کی دنیا سے زیادہ حقیقی اور فطری تھی، کیونکہ وہ میری فکر اور تصور کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی تھی اور اس میں زمان و مکاں اپنی تاثیر کھو بیٹھے تھے۔ اسے گھٹی ہوئی شہوت نے جنم دیا تھا؛ میری چھپی ہوئی ضرورتوں نے ان ناقابل یقین شکلوں اور واقعات کو مجسم کر دیا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد کئی لمحوں تک مجھے اپنے وجود پر شک ہوتا رہتا اور میں زمان و مکاں سے بے خبر رہتا، گویا جو خواب میں دیکھتا تھا، خود میرے ہی بنائے ہوئے تھے اور ان کی تعبیر میں پہلے سے جانتا تھا۔

بہت رات گزر جانے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ ایک دم میں نے خود کو ایک اجنبی شہر کی گلیوں میں آزادانہ گھومتے ہوئے پایا۔ دونوں طرف عجیب شکلوں والے، منشور، مخروط اور مکعب مکانات تھے۔ ان کی کھڑکیاں تنگ اور تاریک تھیں اور در و دیوار پر نیلوفر کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں سکون سے سانس لے رہا تھا لیکن اس شہر کے باشندوں پر ایک عجیب و غریب موت طاری تھی؛ ہر ایک اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور ہر ایک کے منہ سے خون کے دو قطرے اس کے لباس پر ٹپک گئے تھے۔ میں جسے چھوتا اس کا کٹا ہوا سر الگ جا پڑتا۔

میں ایک قصاب کی دکان کے پاس پہنچا اور دیکھا کہ بوڑھے بساطی سے مشابہ ایک شخص گردن پر شال لپیٹے اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری ہے اور وہ سرخ آنکھوں سے، جیسے ان کے پپوٹے کاٹ دیے گئے ہوں، ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے چھری اس کے ہاتھ سے لینی چاہی تو اس کا کٹا ہوا سر زمین پر گر پڑا۔ میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ گلیوں میں دوڑتے ہوئے میں نے لوگوں کو دیکھا کہ اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے ہیں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنے اردگرد دیکھا۔ میں اپنی بیوی کے باپ کے گھر کے سامنے تھا اور اس حرافہ کا چھوٹا بھائی چبوترے پر بیٹھا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو کلیچے نکالے اور اسے تھمانے چاہے، لیکن جوں ہی میں نے اسے چھوا، اس کا کٹا ہوا سر زمین پر گر پڑا۔ میں چیخ مار کر بیدار ہو گیا۔

ابھی ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ چھت میرے سر پر آ پڑی ہے اور دیواریں بے اندازہ موٹی ہو گئی ہیں اور میرا سینہ گویا شق ہوا جا رہا ہے۔ میری نظر دھندلا گئی تھی۔ بہت دیر میں، وحشت زدہ، کمرے کے شہتیروں کو گھورتا رہا۔ میں انھیں گنتا اور پھر دوبارہ گنتا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی آہٹ سنائی دی۔ آیا کمرے میں جھاڑو دینے آ گئی تھی۔ اس نے میرا ناشتہ لا کر بالا خانے کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ میں اوپر جا کر دریچے کے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے کے سامنے بیٹھا بوڑھا بساطی اتنی بلندی سے نظر نہ آتا تھا۔ میں صرف بائیں جانب سے قصاب کو دیکھ سکتا تھا؛ لیکن اس کی حرکات جو میرے کمرے کی کھڑکی سے ڈراؤنی، سنگین اور سنجیدہ نظر آتی تھیں، اوپر سے مضحکہ خیز اور بے بس معلوم ہو رہی تھیں جیسے اس شخص کو قصابی سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ ڈھونگ رچا رہا ہے۔ پھر دو سیاہ لاغر گھوڑے لائے گئے جن کے دونوں طرف بھیڑیں لٹکی ہوئی تھیں اور وہ خشک اور گہری آواز میں کھانس رہے تھے۔ قصاب نے اپنا سنا ہوا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا، بھیڑوں پر ایک خریدار کی سی نگاہ ڈالی اور بڑی دقت سے ان میں سے دو کو اتار کر اپنی دکان کے دروازے پر کنڈے میں لٹکا دیا۔ وہ بھیڑوں کی رانیں تھپتھپانے لگا۔ ضرور جب وہ رات کو اپنی بیوی کے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہو گا تو اسے بھیڑوں کا خیال آتا ہو گا اور وہ سوچتا ہو گا کہ اگر اپنی بیوی کو ذبح کر دے تو کتنے پیسے کمائے گا۔

جب جھاڑو دی جا چکی تو میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور ایک ارادہ کر لیا — ایک وحشت ناک ارادہ۔ میں کوٹھری میں گیا اور ہڈی کے دستے والی ایک چھری، جو صندوقچی میں رکھی تھی، نکال لایا۔ اپنی قمیص کے دامن سے اس کا پھل پونچھا اور اسے اپنے تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ یہ ارادہ میرا بہت پہلے سے تھا لیکن نہ جانے اس قصاب کی حرکات میں کیا تھا کہ جب اس نے بھیڑوں کی رانوں کی بوٹی بوٹی کر کے تولا تو اس پر ایسی تحسین آمیز نگاہ ڈالی کہ میں بھی بے اختیار محسوس کرنے لگا کہ اس کی تقلید کرنی چاہیے؛ اس کیف سے مجھے بھی گزرنا چاہیے۔

کمرے کی کھڑکی سے بادلوں کے درمیان آسمان کا ایک بالکل شفاف ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہاں تک پہنچ پانے کے لیے ایک بہت اونچی سیڑھی لانی پڑے گی۔ آسمان کے کنارے گہرے زرد، مرگ آلود بادلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور پورے شہر پر یہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

فضا وحشت ناک اور پر کیف تھی۔ نہ جانے کیوں میں زمین کی طرف جھک گیا۔ ہمیشہ ایسی فضا میں مجھے موت کا خیال گھیر لیتا تھا لیکن اب تو خونی چہرے والی موت اپنے ہڈیالے ہاتھوں سے میرا اگلا دبا رہی تھی۔ اب میں نے ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے اس حرافہ کو ساتھ ہی لے جانے کا ارادہ کر لیا تھا، تاکہ وہ میرے بعد یہ نہ کہہ سکے، ''خدا اسے بخشے، آخر سکون ہوا۔''

اس وقت میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے ایک تابوت لایا جا رہا تھا جسے سیاہ کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس پر ایک شمع جل رہی تھی۔ لا الٰہ الا اللہ کی آواز سے میں چونک پڑا۔ سب دکاندار اور راہگیر راستے سے ہٹ گئے اور پھر تابوت کے پیچھے سات قدم چلنے لگے۔ یہاں تک کہ قصاب بھی آیا اور ثواب کی خاطر سات قدم تابوت کے پیچھے چل کر اپنی دکان کو لوٹ گیا۔ لیکن بوڑھے بساطی نے اپنی بساط کے سامنے سے جنبش نہ کی۔ سب لوگوں کے منہ کیسے لٹک گئے تھے! شاید انھیں موت اور دوسری دنیا کا فلسفہ یاد آ گیا تھا۔ جب آیا میرے لیے جوشاندہ لے کر آئی تو میں نے دیکھا، اس کی پیشانی شکن آلود تھی، ہاتھ میں لمبی سی تسبیح تھی اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر وہ میرے کمرے کے پیچھے جائے نماز پر کھڑی ہو کر بلند آواز میں تلاوت کرنے لگی: ''اللھم ... اللھم ...''

یوں لگتا تھا جیسے میں زندوں کی بخشش پر مامور ہوں! لیکن یہ سب مسخرہ بازی مجھ پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ بلکہ مجھے تو مزہ آتا تھا کہ یہ سفلے بھی جھوٹے اور عارضی انداز ہی میں سہی، چند لمحوں کے لیے میری جیسی کیفیت سے گزرتے تو ہیں۔ کیا میرا کمرہ تابوت نہ تھا؟ میرا بستر قبر سے زیادہ سرد اور تاریک نہ تھا؟ یہ بستر جو ہمیشہ پڑا مجھے سونے کے لیے پکارتا رہتا تھا۔ کئی بار

مجھے محسوس ہوا کہ میں تابوت میں پڑا ہوں۔ راتوں کو کمرہ سمٹ کر مجھے بھینچنے لگتا۔ کیا قبر میں ایسا ہی نہیں لگتا؟ کیا کوئی مرنے کے بعد کے احساس سے واقف ہے؟

اگرچہ مرنے کے بعد خون بدن میں تھم جاتا ہے اور ایک رات دن کے بعد جسم کے اعضا گلنے لگتے ہیں، لیکن موت کے کچھ مدت بعد تک بال اور ناخن بڑھتے رہتے ہیں۔ کیا محسوس کرنے اور سوچنے کی قوت بھی دل کے رک جانے کے ساتھ ہی رک جاتی ہے یا کچھ عرصے تک چھوٹی نسوں میں باقی رہ جانے والے خون کے ساتھ ایک موہوم زندگی کا پیچھا کرتی رہتی ہے؟ موت کا احساس خود خوفناک ہے، کہاں مر چکے ہونے کا احساس! کچھ بوڑھے لوگ یوں مسکراتے ہوے مرجاتے ہیں جیسے ایک نیند سے دوسری نیند میں چلے گئے ہوں، یا چراغ بجھ گیا ہو؛ لیکن ایک جوان شخص جو ناگہاں مرجاتا ہے اور اس کے قویٰ کچھ دیر تک موت سے مزاحم رہتے ہیں، کیا محسوس کرتا ہوگا؟

مجھے اپنی موت کا اور جسم کے گلنے کا بارہا خیال آتا تھا اور اب مجھے اس خیال سے ڈر نہیں لگتا تھا بلکہ میری تو حقیقی آرزو تھی کہ میں نیست و نابود ہو جاؤں۔ صرف اس بات سے ڈرتا تھا کہ میرے جسم کے ذرات ان سفلوں کے جسموں میں نہ مل جائیں۔ یہ خیال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ مرنے کے بعد مجھے لمبی حساس انگلیوں والے لمبے ہاتھ مل جائیں جن سے میں اپنے جسم کے سارے ذرّوں کو دقت سے جمع رکھوں اور نگرانی کروں کہ وہ جو میرا مال ہیں، ان سفلوں کے جسموں میں نہ جائیں۔

کبھی مجھے یہ خیال آتا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، مرتے وقت ہر ایک کو یہی محسوس ہوتا ہوگا۔ اضطراب، ہول، ہراس اور زندگی کی رغبت مجھ میں ٹھہر گئی ہے۔ جو عقائد مجھے سکھائے گئے تھے انھیں دور کرنے کے بعد مجھے اپنے اندر ایک خاص طرح کا سکون محسوس ہوتا تھا۔ مرنے کے بعد نیست و نابود ہو جانے کی امید میری دلجوئی کرنے والی واحد چیز تھی۔ اگلی زندگی کا خیال مجھے خوف اور تھکن میں مبتلا کر دیتا تھا۔ میں اب تک جس دنیا میں زندہ تھا اسی سے انس

پیدا نہیں کر پایا تو دوسری دنیا سے مجھے کیا واسطہ؟ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ دنیا میرے لیے نہیں بلکہ مٹھی بھر بے حیا، موٹے تازے بھک منگوں، بار برداروں اور دل اور آنکھ کے بھوکوں کے لیے ہے؛ ان لوگوں کے لیے جو اس دنیا کے لائق بنائے گئے ہیں اور جو زمین اور آسمان کے زور آوروں کے سامنے یوں دُم ہلا ہلا کر بھیک مانگتے اور خوشامد کرتے ہیں جیسے قصاب کی دکان کے سامنے بھوکا کتا ہڈی کے لیے دُم ہلاتا ہے۔ دوسری زندگی کا خیال ہی مجھے خوفزدہ کر دیتا تھا اور تھکا دیتا تھا۔ نہیں، مجھے ان تے آور دنیاؤں اور ان منحوس چہروں کو دیکھنے کی کوئی احتیاج نہیں۔ لیکن خدا یہ سب دکھانے پر اتنا اتارو تھا کہ اپنی دنیا میں بار بار میری آنکھوں کے سامنے لاتا تھا۔ مگر میں جھوٹی خوشامد نہیں کر سکتا۔ میری خواہش تھی کہ اگر مجھے ایک اور زندگی گزارنی ہے تو میرے خیالات اور حواس کند ہو جائیں؛ میں بغیر زحمت کے سانس لے سکوں اور بغیر تھکے کسی لنگم مندر کے ستونوں کے سائے میں، اپنے آپ میں گم، زندگی گزاردوں، ایسے کونے میں جا بیٹھوں جہاں سورج کی روشنی میری آنکھوں پر نہ پڑے اور لوگوں کی باتیں اور زندگی کا شور میرے کانوں کو نہ کھرچے۔

جاڑوں میں کھوہ میں چھپ جانے والے جانور کی طرح میں نے کتنی ہی بار خود میں پناہ لی، لیکن دوسروں کی آوازیں کانوں میں اور اپنی آواز گلے میں سنائی دیتی رہی۔ تنہائی اور گوشہ گیری میرے اردگرد چھپی ہوئی تھی۔ وہ گھپ اندھیری، ازلی اور نہ ختم ہونے والی راتوں کی طرح تھی جن کا اندھیرا گاڑھا، لیس دار اور فاسد سیال تھا اور جو شہوت انگیز اور کینہ پرور نیندوں سے بھرے خاموش شہروں پر اترنے کی منتظر تھیں۔ اپنے گلے کے سامنے میں ایک مطلق اور جنونی اثبات سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جماع میں دو انسانوں کا اپنے اکیلے پن سے فرار کے لیے بھینچ کر ایک دوسرے سے چمٹ جانے کا سبب وہی پاگل پن کا بہاؤ ہے جو ہر شخص میں موجود رہتا ہے اور اس میں ملا جلا یہ افسوس کہ وہ آہستہ آہستہ موت کی گھاٹی کی طرف گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔

صرف موت ہے، جو جھوٹ نہیں بولتی۔

موت کے حضور سارے وہم مٹ جاتے ہیں۔ ہمیں موت ہی نے جنم دیا ہے اور موت ہی ہمیں زندگی کے فریبوں سے نجات دلاتی ہے اور زندگی کی تہہ میں وہی ہے جو ہمیں پکارتی اور اپنی طرف بلاتی ہے۔ اس عمر میں جب لوگوں کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اگر ہم کبھی کھیلتے کھیلتے چونک کر تھم جاتے ہیں تو اسی لیے کہ ہم موت کی آواز سن لیتے ہیں۔ . . اور زندگی کی ساری گزران میں موت ہی ہے جو ہمیں اشارہ کرتی رہتی ہے۔ کیا ہر ایک کے ساتھ یہ اتفاق نہیں ہوتا کہ وہ ناگہاں اور بغیر کسی وجہ کے سوچ میں پڑ جاتا ہے اور اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ زمان و مکاں سے بے خبر ہو جاتا ہے، اور یہ بھی نہیں جانتا کہ کس چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ بعد میں اسے ظاہر کی دنیا سے دوبارہ آگاہ اور آشنا ہونے کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ یہ موت ہی کی پکار ہے۔

پسینے کی بساند والے اس نمناک بستر میں جب میری پلکیں بوجھل ہونے لگتیں اور میں خود کو عدم اور نہ ختم ہونے والی رات کو سونپ دینا چاہتا تو ساری گمشدہ یادیں اور سب بھولے ہوئے خوف پھر سے زندہ ہو جاتے — یہ خوف کہ تکیے کے پَر کہیں خنجر کے پھل نہ بن جائیں، لباس کے تکمے کہیں پھیل کر چکی کے پاٹوں جتنے نہ ہو جائیں، یہ ڈر کہ روئی کے بچے ہوئے ٹکڑے زمین پر گر کر کانچ کی طرح ٹوٹ نہ جائیں، یہ بے چینی کہ اگر سو گیا تو چراغ کا تیل زمین پر کھنڈ کر سارے شہر میں آگ نہ لگا دے، یہ وسوسہ کہ قصاب کی دکان کے سامنے کھڑے کتے کے قدموں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ نکلنے لگے، یہ ہول کہ ابھی بوڑھا بساطی قہقہے لگانے لگے گا اور اس زور سے کہ اپنی آواز کو خود بھی نہ تھام سکے گا، یہ خوف کہ پاؤں دھونے کے حوض کے کیڑے ہندی ناگ بن جائیں گے، یہ ڈر کہ میرا بستر قبر کا پتھر بن جائے گا اور دھم سے گر کر مجھے دفن کر دے گا اور پتھر کے دانت بھینچ کر بند ہو جائیں گے، میری زبان گنگ ہو جائے گی اور پھر میں کتنے ہی زور سے چلاؤں، کوئی میری آواز نہ سن پائے گا. . .

میں اپنے بچپن کو یاد کرنا چاہتا، لیکن جب ان دنوں کو محسوس کرنے لگتا تو وہ بھی اتنے ہی سخت اور دردناک ہوتے۔

قصاب کی دکان پر کھڑے سیاہ لاغر گھوڑوں جیسی میری کھانسی کی آواز اس ڈر اور ہول میں یہ اضافہ کر دیتی کہ کہیں خون کے لوتھڑے اس میں شامل نہ ہو جائیں — خون، یہ گاڑھا اور نمکین سیال جو کہیں جسم کے اندر سے اُبل آتا ہے اور پھر ناچار اس شیرۂ زندگی کو قے کر کے باہر نکالنا پڑتا ہے؛ موت کی مسلسل دھمکی جو اپنی طرف لوٹنے والے سارے خیالوں کو کچلتی گزر جاتی تھی اور خوف اور ہراس طاری کر دیتی تھی۔

زندگی اپنے سرد اور بے اعتنا انداز سے ہر ایک پر اس کی اصل صورت ظاہر کر دیتی ہے، گویا ہر شخص کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے صرف ایک نقاب ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور قدرتی طور پر وہ غلیظ ہو جاتا ہے اور اس پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ بخیلوں کا قبیلہ ہے۔ بعض لوگ اپنے نقابوں کو احتیاط سے رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ بعض اپنی نقابیں مستقل بدلتے رہتے ہیں لیکن بڑھاپے کو پہنچتے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آخری نقاب ہے اور بہت جلد اسے گھس گھسا کر خراب ہو جانا ہے اور پھر ان کا اصل چہرہ اس میں سے باہر آ جائے گا۔

نہ جانے میرے کمرے کی دیواروں میں کیا تاثیر تھی کہ میرے خیالات بھی زہریلے ہو جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ کبھی کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے پاگل خونی کو مرنے تک یہاں رکھا گیا ہوگا۔ نہ صرف کمرے کی دیواریں بلکہ باہر کا منظر، وہ قصاب، بوڑھا بساطی، میری آیا، وہ حرافہ اور سب لوگ جنھیں میں دیکھتا تھا، اور وہ پیالہ تک جس میں مجھے جَو کا شوربہ دیا جاتا تھا، سب مجھ میں یہ خیالات پیدا کرنے کی سازش میں شریک تھے۔

چند رات پہلے جب میں نے حمام کے شہ نشین میں اپنے کپڑے اتارے تو میرے خیالات بدل سے گئے۔ استاد حمامی میرے سر پر پانی ڈال رہا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے میرے سیاہ

خیالات ڈھل رہے ہوں۔ میں نے بھاپ سے سیلی ہوئی دیوار پر اپنا سایہ پڑتا دیکھا۔ میں نے دیکھا، میں اس قدر کمزور اور نازک ہو چکا تھا جیسا دس برس پہلے اپنے بچپن میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تب بھی میرے جسم کا سایہ حمام کی پسیجی ہوئی دیوار پر اسی طرح پڑا کرتا تھا۔ میں نے غور سے خود کو دیکھا — میری رانیں، پنڈلیاں، پاؤں اور جسم کا درمیانی حصہ ایک شہوانی ناامیدی کی حالت میں تھے۔

میرے اعضا کا سایہ دس سال پہلے کی طرح تھا، جب میں بچہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی ساری کی ساری حمام کی دیوار پر ایک لرزتے اور بھٹکتے ہوئے سائے کی طرح بے معنی اور بے مقصد گزر گئی ہے۔ لیکن دوسرے لوگ بھاری اور ٹھوس اور موٹی گردن والے تھے۔ ضرور ان کا سایہ بھی حمام کی گیلی دیوار پر زیادہ بڑا اور گہرا پڑتا ہوگا، جبکہ میرا سایہ فوراً مٹ جاتا تھا۔ جب میں نے کپڑے پہن لیے تو میری حرکات، چہرہ اور خیالات پھر بدل گئے؛ جیسے میں ایک نئی دنیا کے محیط میں داخل ہو گیا، جیسے میں پھر اسی دنیا میں پیدا ہو گیا جس سے متنفر تھا۔ میں پھر سے زندگی میں آ گیا اور یہ مجھے معجزہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نمک کے ڈلے کی طرح گھل نہیں گیا تھا۔

اپنی زندگی مجھے اتنی ہی غیر فطری، انجانی اور ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے جیسے اس قلمدان کے ڈھکنے پر بنا ہوا نقش جس کے پاس بیٹھا میں لکھ رہا ہوں۔ گویا کسی جنونی اور وہمی نقاش نے قلمدان پر یہ نقش کھینچ دیا تھا۔ جب میں اس پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ مجھے غالباً اس نقش ہی کی وجہ سے جانا پہچانا لگتا ہے۔ شاید یہی نقش مجھے لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک سرو کا درخت جس کے نیچے عبا پہنے اور پگڑی باندھے ہندوستانی جوگیوں جیسا ایک خمیدہ پشت بوڑھا تعجب کے عالم میں اپنے منھ پر بائیں ہاتھ کی انگلی رکھے بیٹھا ہوا ہے، اس کے سامنے ایک لڑکی سیاہ لباس پہنے غیر معمولی انداز میں رقص کر رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں نیلوفر کا پھول ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک آبجو حائل ہے۔

میں افیون کی چلم سے کش لے کر اپنے تاریک خیالات کو لطیف آسمانی دھویں میں اڑا رہا تھا۔ اس وقت میرا جسم سوچ رہا تھا، خواب دیکھ رہا تھا، لڑکھڑا رہا تھا اور زمین کی کشش اور فضا کی گدلاہٹ سے آزاد ہو کر انجانی تصویروں اور رنگوں سے بھری ایک انجانی دنیا میں پرواز کر رہا تھا۔ افیون نے مجھ میں نباتات کی روح، سبزے کی اُگن کی روح پھونک دی تھی اور میں عالم نباتی میں سیر کر رہا تھا، یا شاید نباتات کی سطح پر زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن انگیٹھی اور چمڑے کی بساط کے پاس بیٹھے، کش لیتے ہوے، مجھے نہ جانے کیوں وہ بوڑھا بساطی یاد آ گیا۔ وہ بھی اپنی بساط کے سامنے جھکا اسی حالت میں بیٹھتا تھا۔ اس خیال نے مجھ میں وحشت پیدا کر دی۔ میں نے اٹھ کر عبا اتار پھینکی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے رخسار قصاب کی دکان پر لٹکے گوشت کے رنگ کے ہو گئے تھے اور تپ رہے تھے۔ داڑھی بے ترتیب تھی لیکن اس میں ایک روحانی اور پرکشش تاثر تھا، بیمار آنکھوں میں تھکن، رنجیدگی اور بچپن کی سی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ مجھ میں زمینی، ٹھوس اور انسانی تھا، پگھل چکا تھا۔ مجھے اپنی صورت اچھی لگی؛ ایک قسم کا شہوانی کیف محسوس ہوا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے خود سے کہا، ''تیرا درد اس قدر گہرا ہے کہ تیری آنکھوں کی تہوں میں بیٹھ گیا ہے... اور اگر تو رونا چاہے تو آنسو کہیں آنکھوں کے پیچھے سے نکلیں گے، یا شاید نکلیں گے ہی نہیں!''

پھر میں نے کہا، ''تو احمق ہے۔ اپنا پاپ جلدی کیوں نہیں کاٹ دیتا؟ کس بات کا انتظار ہے؟ اب کاہے کی امید ہے؟ کیا کوٹھری میں شراب کی بوتل نہیں رکھی؟ ایک گھونٹ لے اور سب کچھ ختم کر!... احمق!... تو احمق ہے! میں ہوا سے بات کر رہا ہوں!''

مجھے جو خیالات آ رہے تھے وہ بکھرے ہوے اور بے ربط تھے۔ مجھے اپنے گلے میں اپنی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اس کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ آوازیں دوسری آوازوں میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں جیسا کہ مجھے بخار کی حالت میں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اپنی انگلیاں معمول سے زیادہ بڑی لگ رہی تھیں اور پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میرے

ہونٹ سوج گئے تھے جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ آیا دروازے کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ آیا کا چہرہ ساکت تھا اور اس کی بے نور آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، لیکن ان میں کوئی اچنبھا یا غصہ یا رنجیدگی نہیں تھی۔ عام طور پر احمقانہ حرکت مضحکہ خیز لگتی ہے، لیکن میرا قہقہہ اس سے زیادہ گہرا تھا۔ یہ بڑی حماقت ان چیزوں میں سے تھی جنھیں دنیا میں کوئی سمجھ نہیں پاتا۔ جو کچھ رات کی تاریکی میں گم ہو گیا وہ انسانی قدرت سے باہر موت کی جنبش ہے۔ آیا نے چلم اٹھائی اور سہج سہج قدم رکھتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ ہتھیلیوں میں سفید سفید دھبے پڑ گئے تھے۔ تکیہ دیوار سے لگا کر میں نے سر ٹکا لیا تو ذرا آرام محسوس ہوا۔ پھر یہ گیت جو نہ جانے کہاں سنا تھا، ہولے ہولے گنگنانے لگا:

چلو کہ چل کے مے پییں

شرابِ ملکِ رے پییں

ہمیشہ کسی بحران کے آنے سے پہلے میرے دل پر اثر ہونے لگتا اور ایک اضطراب مجھ میں پیدا ہو جاتا تھا۔ اضطراب اور غم، جیسے میرے دل کے گرد کسی نے گرہ لگا دی ہو؛ جیسے طوفان آنے سے پہلے کا سناٹا... تب حقیقت کی دنیا مجھ سے دور ہو جاتی اور میں ایک ایسی چمکیلی دنیا میں جینے لگتا جو زمینی دنیا سے بے حساب فاصلے پر ہوتی تھی۔

اس وقت مجھے خود سے خوف آنے لگتا، ہر ایک سے خوف آنے لگتا، جیسے یہ بیماری کی حالت ہو۔ یہ اس لیے تھا کہ میری سوچنے کی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے قصاب اور بوڑھے بساطی کو دیکھتا تو خوفزدہ ہو جاتا۔ معلوم نہیں ان کے چہروں اور حرکات میں کیا خوفناک چیز تھی۔ آیا نے مجھے ایک خوفناک بات بتائی تھی۔ وہ پیروں پیغمبروں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ اس نے رات میں بوڑھے بساطی کو میری بیوی کے کمرے میں آتے دیکھا اور دروازے کے پیچھے سے سنا، وہ حرافہ اس سے کہہ رہی تھی، ''اپنی گردن سے شال اتار دو۔'' یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پرسوں یا ترسوں جب میں چیخنے لگا اور میری بیوی کمرے کی چوکھٹ

تک آئی تو میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے ہونٹوں پر اس بوڑھے کے میلے، زرد اور ریک زدہ دانتوں کے نشان دیکھے جن میں سے قرآن کی آیتیں باہر نکلا کرتی تھیں۔ آخر کیوں یہ شخص، جب سے میں نے اس عورت سے شادی کی، میرے گھر کے سامنے موجود ہے؟ کیا وہ میری بیوی کا عاشق ہے؟ مجھے یاد ہے، میں اسی روز اس بوڑھے کے پاس گیا اور اس کوزے کے دام پوچھے۔ اس کی گردن پر لپٹی شال میں سے اس کے دو کیڑے لگے دانت جھانک رہے تھے۔ وہ ایسی کھرکھراتی ہوئی خشک آواز میں ہنسا کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ پھر بولا، ''بغیر دیکھے خریدو گے؟ اس کوزے کی کیا قیمت! لے جاؤ۔ تمھیں مبارک ہو!'' پھر ایک خاص انداز میں کہا، ''اس کی کیا قیمت! لے جاؤ۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو درہم اور چار پشیز اس کے توشہ دان پر ڈال دیے۔ پھر وہ ہنسا، رونگٹے کھڑے کر دینے والی خشک ہنسی۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر لوٹ آیا۔

اس کی چادر میں سے زنگ لگی، گندی اور ٹھکرائی ہوئی چیزوں کی بو اٹھ رہی تھی، ان چیزوں کی جنھیں زندگی نے جواب دے دیا تھا۔ شاید وہ زندگی کی ٹھکرائی ہوئی چیزوں کو لوگوں کے سامنے لا کر انھیں ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ کیا وہ خود بھی بوڑھا اور ٹھکرایا ہوا نہیں تھا؟ اس کی بساط پر رکھی چیزیں مردہ، میلی اور بے مصرف تھیں لیکن کیسی ڈھیٹ زندگی رکھتی تھیں اور ان کی شکلیں کیسی پرمعنی تھیں! ان چیزوں نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ زندہ لوگ بھی نہیں کر سکتے۔

لیکن آیا میرے لیے اس کی خبر لائی تھی اور اسی نے سب کو بتایا تھا... ایک غلیظ بھکاری کے ساتھ! آیا نے کہا کہ میری بیوی کے بستر میں جوئیں پڑ گئی ہیں اور وہ خود نہا رہی ہے۔ اس کا سایہ حمام کی گیلی دیوار پر کیسا پڑ رہا ہوگا؟ یقیناً ایک شہوانی سایہ جو اپنی ہی تمنا میں گم ہوگا۔ بہرحال اس مرتبہ مجھے اپنی بیوی کے ذوق سے کوئی دھچکا نہیں لگا کیونکہ بوڑھا بساطی ان نسل کش مردوں کی طرح کا معمولی، چرب زبان اور بے مزہ شخص نہیں تھا جن پر ہوس پرست اور احمق عورتیں ریجھ جاتی ہیں۔ اس کے بوڑھے چہرے پر درد اور بدبختی کی جو تہیں تھیں اور جو

نحوست اس کے آس پاس سے اٹھتی تھی — شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ خدا انسانوں کے سامنے ایک خنجر کی طرح اس کی نمائش کر رہا ہے اور وہ اپنے سامنے رکھی میلی چیزوں کی بساط سمیت تخلیق کا مظہر اور نمائندہ ہے۔

ہاں، اپنی بیوی کے چہرے پر میں نے اس کے ان دو زرد ریک زدہ دانتوں کے نشان دیکھے تھے جن میں سے آیتیں باہر آیا کرتی تھیں۔ وہی عورت جو مجھے اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھی اور حقارت سے پیش آتی تھی — مجھے اس سے محبت تھی، باوجود اس کے کہ اس نے کبھی مجھے اپنے ہونٹ چومنے نہ دیے تھے!

سورج پیلا پڑ چکا تھا۔ نقارے کی سوزناک صدا بلند ہوئی، وہ التجا آمیز آواز جو سارے موروثی وہم اور اندھیرے کا خوف بیدار کر دیتی ہے۔ وہ بحران جس کی حالت اس کے آنے سے پہلے مجھ پر طاری ہو گئی تھی، آ پہنچا۔ میں سر سے پیر تک بخار میں جل رہا تھا اور میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں جا کر بستر میں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بخار کی شدت سے یوں لگ رہا تھا کہ ساری چیزیں پھیل کر بڑی ہو گئی ہیں اور ان کے کنارے دھندلا گئے ہیں۔ چھت نیچے آتے آتے اوپر اٹھ جاتی تھی۔ کپڑے میرے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ میں بے وجہ اٹھ بیٹھا اور خود سے سرگوشی کرنے لگا:

''بہت ہو چکا... ناقابلِ برداشت...'' میں ایک دم چپ ہو گیا اور پھر رک رک کر تمسخر آمیز بلند آواز میں بولا، ''اس سے زیادہ...'' پھر یہ کہ، ''میں احمق ہوں۔'' جو لفظ میرے منھ سے نکل رہے تھے میری توجہ ان پر نہ تھی؛ میں صرف فضا میں اپنی آواز کے ارتعاش سے مزہ لے رہا تھا۔ شاید تنہائی مٹانے کی خاطر اپنے سائے سے باتیں کر رہا تھا۔ تب میں نے یقین میں نہ آنے والی ایک چیز دیکھی۔ دروازہ کھلا اور وہ حرافہ اندر آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اسے میرا خیال آ جاتا ہے۔ اس کا احسان ابھی باقی تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ میں ابھی زندہ ہوں اور عذاب میں ہوں اور آہستہ آہستہ مروں گا۔ اس کا احسان ابھی باقی تھا۔ میں صرف یہ

جاننا چاہتا تھا کہ اسے یہ معلوم ہے یا نہیں کہ میں اس کی خاطر مر رہا ہوں۔ اگر اسے معلوم تھا تو میں آسودہ اور خوش بخت مر رہا تھا؛ تب میں دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ خوش بخت تھا۔ جوں ہی وہ حرافہ کمرے میں داخل ہوئی، میرے بُرے خیالات ہوا ہو گئے۔ اس کے وجود سے اور اس کی حرکات سے نہ جانے کیسی شعاعیں نکلتی تھیں جو مجھے تسکین دیتی تھیں۔ اب کے اس کی حالت بہتر تھی۔ وہ فربہ اور گدرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ طوسی چادر نے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ بھنویں ترشی ہوئی تھیں، تل لگا ہوا تھا اور اس نے سرخی، سفیدہ اور سرمہ بھی لگا رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ سارے سنگھار کر کے وہ کمرے میں آئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے خوش ہے۔ اس نے بے اختیاری میں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی منہ میں رکھی ہوئی تھی۔ کیا یہ وہی نازک دوشیزہ، وہی کھلنڈری آسمانی لڑکی تھی جو سیاہ چنا ہوا لباس پہنتی تھی اور جس کے ساتھ میں سورن نہر کے کنارے آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا؟ وہی لڑکی جو بے پروا، بچگانہ اور ناپائیدار انداز رکھتی تھی اور جس کی پنڈلیوں کی شہوت انگیز جھلک اس کے لباس میں سے نظر آ رہی ہوتی تھی؟ اب تک میں نے اسے دیکھا تو تھا لیکن اچھی طرح غور سے نہیں۔ اب یوں لگتا تھا جیسے میری آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے قصاب کی دکان پر لٹکی ہوئی بھیڑیں یاد آ گئیں۔ اچانک وہ میرے لیے محض گوشت کا ایک لوتھ بن گئی اور اس کی دلربائی بالکل جاتی رہی۔ اب وہ ایک گداز اور چمکیلی عورت تھی — زندگی کی فکروں میں گم ایک عیار عورت، میری عورت! میں نے خوف اور وحشت کے ساتھ دیکھا کہ میری بیوی پکی عمر کی ایک ہوشیار عورت بن چکی ہے، جبکہ میں اپنے بچپن میں رہ گیا تھا۔ اصل میں مجھے اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے شرم آتی تھی۔ یہ عورت جو میرے سوا سب پر اپنے جسم کے دروازے کھول دیتی تھی اور میں خود کو صرف اپنے اور اس کے بچپن کی یادوں سے بہلاتا تھا، جب اس کا چہرہ بچوں کی طرح سادہ تھا اور انداز مگن اور بے گرفت تھا اور ابھی بوڑھے بساطی کے دانتوں کے نشان اس کے چہرے پر نہیں ابھرے تھے۔ نہیں، یہ وہ نہیں تھی۔

اس نے طعنہ دیتی ہوئی آواز میں پوچھا، ''کیسی طبیعت ہے؟''

میں نے جواب دیا، ''کیا تم آزاد نہیں ہو؟ جو تمھارے دل میں آتا ہے، نہیں کرتیں؟ میری طبیعت سے تمھیں کیا؟''

وہ زور سے دروازہ بند کر کے چلی گئی، مڑ کے مجھے دیکھا تک نہیں۔ گویا میں اس دنیا کے لوگوں سے، زندوں سے، بات کرنے کا ڈھنگ بھول چکا تھا۔ وہ عورت جسے میں تمام احساسات سے عاری سمجھتا تھا، میری حرکت سے رنجیدہ ہو گئی تھی! میں نے کئی بار اٹھنا چاہا تا کہ جا کر اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں، روؤں... ہاں، روؤں، کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید رونے سے سکون آجائے۔ چند لمحے، چند گھنٹے یا چند دن گزر گئے — معلوم نہیں۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی اور میں اپنے درد سے مزہ لے رہا تھا، ایک ماورائے بشر لذت اٹھا رہا تھا۔ یہ کیف صرف میں محسوس کر سکتا تھا اور اگر خداؤں کا وجود ہوتا تو وہ بھی اس کیف کا اندازہ نہ کر سکتے۔ تب مجھے اپنی برتری کا احساس ہوا — خدا جو انسان کی شہوت کی پیدائش ہیں، میں خود ایک خدا بن گیا تھا، خدا سے بھی بڑا، کیونکہ مجھے خود میں ایک جاودانی اور کبھی نہ ختم ہونے والا بہاؤ محسوس ہو رہا تھا...

... لیکن وہ پھر آئی۔ وہ اتنی سنگدل نہیں تھی جتنا میں نے تصور کیا تھا۔ میں اٹھا، اس کا دامن چوما اور روتے اور کھانستے ہوئے اس کے قدموں پر گرا۔ اس کے پیروں سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا اور اسے بار بار اس کے اصل نام سے پکارنے لگا۔ اس کے اصل نام کی خاص طرح کی آواز اور گونج سنائی دے رہی تھی، لیکن اپنے دل میں، اپنے دل کی گہرائیوں میں، میں کہہ رہا تھا: ''حرافہ، حرافہ...''

میں نے اس کے پیروں کو، جن کا مزہ ککڑی کے ڈنٹھل کی طرح کسیلا اور تلخ تھا اور جو بہت ملائم اور چکنے تھے، بغل میں لے لیا۔ میں اتنا رویا، اتنا رویا کہ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ جب میں اپنے آپ میں آیا تو وہ جا چکی تھی۔ شاید ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں میں نے

انسان کا سارا کیف، عنایت اور رنج خود میں محسوس کر لیا تھا اور اُسی حالت میں جیسے بوڑھے بساطی کے انداز میں افیون کی چلم کے سامنے بیٹھا کرتا تھا، دھواں دیتے چراغ کے سامنے بیٹھا رہ گیا۔ اپنی جگہ سے ہلے بغیر، اسی حالت میں چراغ کے دھویں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دھواں میرے ہاتھوں پر اور میرے چہرے پر سیاہ برف کی طرح جم گیا۔ جب آیا جو کا دلیا اور چوزے کی یخنی میرے لیے لائی تو سینی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ اور وہ خوف اور دہشت سے چلّاتی ہوئی الٹے قدموں لوٹ پڑی۔ میں خوش ہوا کہ اسے ڈرا دیا۔ پھر میں نے اٹھ کر چراغ کی لو کو ہاتھ سے مل کر بجھا دیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں نے دھویں کی کالک منھ پر مل لی — کیسا ڈراؤنا چہرہ! میں نے انگلیوں سے آنکھیں پھاڑ لیں اور پھر چھوڑ دیں۔ پھر منھ میں انگلیاں ڈال کر اسے چیر لیا، گال پھلا لیے، داڑھی کا سرا اٹھا کر اسے موڑ لیا اور اپنا منھ چڑانے لگا۔ میرے چہرے میں مضحکہ خیز اور ڈراؤنی شکلیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش تھی؛ گویا یہ ساری مضحک، ڈراؤنی اور ناقابلِ یقین شکلیں جو مجھ میں پہلے سے چھپی ہوئی تھیں، میں نے اس وسیلے سے انھیں ظاہر کر کے دیکھا۔ یہ سب شکلیں میں پہچانتا تھا اور اپنے اندر محسوس کرتا تھا، اور ساتھ ہی مجھے مضحک بھی لگتی تھیں۔ یہ سب شکلیں مجھ میں تھیں اور میری ملکیت تھیں — ڈراؤنے اور مجرمانہ اور مضحکہ خیز بہروپ جو انگلی کے اشارے سے بدل جاتے تھے، قرآن پڑھنے والے بوڑھے کی شکل، قصاب کی شکل، اپنی بیوی کی شکل، ان سب کو میں نے خود میں دیکھا۔ گویا ان کا سب کا عکس مجھ میں تھا۔ یہ سب چہرے مجھ میں تھے اور ان میں سے کوئی میرا نہیں تھا۔ کیا میرے اندر میری صورت اور حرکات کا خمیر انجانی تحریکوں، موروثی وسوسوں، جفتیوں اور مایوسیوں سے تیار نہیں ہوا تھا؟ اور کیا میں، اس موروثی بوجھ کا نگہبان، ایک دیوانے اور مضحکہ خیز احساس کے ذریعے سے ان سب چیزوں کو اپنے چہرے میں محفوظ رکھنے میں بے ارادہ اور بے اختیار مصروف نہیں تھا؟ شاید صرف مرتے وقت میرا چہرہ ان وسوسوں کی قید سے آزاد ہو اور اپنی اصل صورت اختیار کرے۔

لیکن کیا یہ حالات جنھوں نے میرے چہرے پر اس تمسخر آمیز ارادے کے نقوش کھود ڈالے تھے، اس آخری صورت پر بھی اپنی پکی اور گہری علامت نہیں چھوڑ دیں گے؟ بہر حال، میں جان گیا کہ جو کچھ میرے ہاتھوں ہوا تھا، میں اسے اب تک اپنی ہی قابلیت سمجھتا رہا تھا۔ ایک دم میں زور سے ہنسا۔ وہ ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کھر کھراتی اور ڈراؤنی ہنسی تھی کہ میری آواز خود میری پہچان میں نہ آئی۔ میری ہنسی کسی باہر کی آواز کی طرح شاید میرے گلے میں اٹکی ہوئی تھی اور میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ تب ہی مجھے کھانسی کا دورہ پڑا اور ایک خون کا لوتھڑا میرے جگر میں سے نکل کر آئینے پر جا پڑا۔ میں نے انگلی کے سرے سے اسے آئینے پر سے پونچھ دیا۔ جب میں لوٹا تو میں نے دیکھا، آیا اُڑی ہوئی سفید رنگت، بکھرے بالوں اور بجھی ہوئی وحشت زدہ آنکھوں کے ساتھ کھڑی، ہاتھ میں جو کے دلیے کا پیالہ لیے، مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور پردے کے پیچھے جا چھپا۔

جب میں نے سونا چاہا تو ایک جلتا ہوا حلقہ میرے سر کے گرد تنگ ہونے لگا۔ چراغ میں پڑے صندل کے تیل کی تیز شہوت انگیز بو میرے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ میری بیوی کے پیروں کی مہک بھی کہیں آس پاس تھی اور میرے منھ میں ککڑی کے ڈنٹھل کی سی ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا اور خیالوں میں اپنے جسم کے اعضا کا اپنی بیوی کی رانوں، پنڈلیوں اور بازوؤں سے موازنہ کرنے لگا۔ میری بیوی کی رانوں اور کولھوں کے خطوط، اس کے جسم کی گرمی میرے سامنے پھر مجسم ہونے لگی۔ یہ تصویر خیال سے زیادہ طاقتور تھی کیونکہ یہ ایک جسمانی احتیاج کی صورت تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے جسم کو قریب لانا چاہتا ہوں۔ ایک ذرا سی حرکت، محض ایک ارادہ اس شہوت انگیز وسوسے کو مٹانے کے لیے کافی تھا لیکن یہ جلتا ہوا حلقہ میرے سر کے گرد اتنا تنگ اور گرم ہو گیا تھا کہ میں خوفناک ہیولوں کے ایک دھند لے اور خلط ملط دریا میں ڈوبتا چلا گیا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ نشے میں دھت سپاہیوں کے دستے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی جو گلی سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے اور تالیاں بجا بجا کر گا رہے تھے:

چلو کہ چل کے مے پییں
شرابِ ملکِ رے پییں

مجھے یاد آیا، نہیں ایک دم الہام ہوا، کہ کوٹھری میں شراب کی ایک بوتل رکھی ہے— شراب جس میں ناگ کا زہر گھلا ہوا تھا اور جس کے ایک گھونٹ سے زندگی کے یہ سارے کابوس ختم ہو جاتے— لیکن وہ حرافہ؟ اس فقرے نے اس کے لیے میری حرص اور بڑھا دی اور اسے اور زندہ اور پُرحرارت میرے سامنے لا کھڑا کیا۔

میں اس سے بہتر کیا تصور کر سکتا تھا کہ اس شراب کا ایک پیالہ اسے دوں اور ایک خود پیوں کہ تب ایک ساتھ ایک تشنج میں ہوں اور ایک ساتھ مریں! عشق کیا ہے؟ تمام سفلوں کے لیے ایک وقتی گھٹیا پن ہے؛ ان کے عشق کو صرف گھٹیا اور فحش تحریروں اور مستی اور ہوشیاری میں دہرائی جانے والی رکیک اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے میرا عشق اور ہی چیز تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اسے بہت زمانے سے پہچانتا ہوں؛ ہرن کی سی عجیب آنکھیں، تنگ اَدھ کھلا دہانہ، ہلکی اور نرم آواز، یہ سب میرے لیے پرانی دردناک یادوں سے پُر تھا اور میں ان سب میں وہ سب کچھ ڈھونڈتا تھا جس سے محروم رہ گیا تھا، ایک ایسی چیز جس کا مجھ سے گہرا تعلق تھا اور جو مجھ سے لے لی گئی تھی۔

کیا میں ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہوں؟ اس خیال سے مجھ میں اور بھی ڈراؤنا احساس پیدا ہو گیا۔ ایک اور لذت، جو مجھے اپنے ناامید عشق کے بجائے محسوس ہوتی تھی، میرے لیے ایک طرح کا وسوسہ ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ معلوم کیوں، مجھے آستینیں چڑھائے، بسم اللہ پڑھ کر گوشت کاٹتا، کھڑکی کے سامنے والا قصاب یاد آ گیا۔ اس کی وضع قطع ہمیشہ میرے

سامنے رہتی تھی۔ آخر میں نے بھی ارادہ کرلیا — ایک خوفناک ارادہ۔ میں بستر سے اٹھا، آستینیں چڑھائیں اور تکیے کے نیچے سے ہڈی کے دستے والی چھری نکال لی۔ پھر میں نے اپنی کمر جھکالی اور اپنے کاندھوں پر ایک زرد عبا بھی ڈال لی اور اپنے سر اور چہرے کو گردن کی شال میں لپیٹ لیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ مجھ میں قصاب اور بوڑھے بساطی کی ملی جلی روح پیدا ہوگئی تھی۔

تب میں دبے پاؤں اپنی بیوی کے کمرے کی طرف گیا۔ کمرہ تاریک تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خواب دیکھتے میں زور زور سے خود سے کہہ رہی ہو: ''اپنی گردن سے شال اتار دو۔'' میں بستر کے قریب گیا تو اس کے گرم اور ملائم سانس نے میرے سر کو گھیر لیا۔ اس میں کیسی گوارا اور زندہ کردینے والی حرارت تھی! مجھے لگا کہ اگر میں کچھ دیر اسی حرارت میں سانس لیتا رہوں تو پھر سے جی اٹھوں گا۔ اوہ، کتنے زمانے سے مجھے یہی گمان تھا کہ ہر ایک کا سانس میری طرح داغ اور جلتا ہوا ہوگا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ کمرے میں اور کوئی مرد تو نہیں، یعنی اس کے عاشقوں میں سے کوئی؛ لیکن وہ اکیلی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اس کی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے سب بہتان ہے۔ کہاں سے وہ ابھی تک وہی دوشیزہ نہیں تھی؟ مجھے اس کے بارے میں سارے موہوم خیالات پر شرمندگی ہونے لگی۔ یہ احساس لمحہ بھر سے زیادہ نہ رہا، کیونکہ اسی وقت دروازے کے باہر سے چھینک کی آواز سنائی دی اور پھر ایک تمسخر آمیز گھٹی گھٹی ہنسی جو آدمی کے رونگٹے کھڑے کردے۔ اس آواز سے میرے جسم کی ساری رگیں کھنچنے لگیں۔ اگر یہ چھینک اور ہنسی کی آواز نہ آتی، اگر اس آواز نے مجھے ٹوک نہ دیا ہوتا، تو جیسا کہ میں نے ارادہ کیا تھا، میں اس کے بدن کے گوشت کو بوٹی بوٹی کر دیتا اور لے جا کر سامنے والے قصاب کو بیچنے کے لیے دے آتا۔ اور اس کی ران کی بوٹی خود لے جا کر نذر کے طور پر قرآن پڑھنے والے بوڑھے کو دیتا اور اگلے روز جا کر اس سے کہتا: ''جانتے ہو کل جو گوشت کھایا تھا، کس کا تھا؟''

اگر اس کی ہنسی کی آواز نہ آتی تو میں رات ہی رات میں یہ کام کر گزرتا تا کہ اس حرافہ سے پھر آنکھیں نہ ملانی پڑیں، کیونکہ اس کی آنکھوں کی کیفیت مجھے خجالت میں بتلا کر دیتی تھی اور سرزنش کرتی تھی۔ آخر میں نے بستر کے کونے پر پڑا ایک کپڑا اٹھالیا اور ہراساں ہو کر باہر نکل آیا۔ پھر میں نے چھری کو چھت پر پھینک دیا کیونکہ میرے سارے مجرمانہ خیالات اسی سے پیدا ہوے تھے۔ اس چھری کو جو قصاب کی چھری سے مشابہ تھی، میں نے خود سے دور کر دیا۔

کمرے میں واپس آکر میں نے چراغ کی روشنی میں دیکھا کہ میں جو کپڑا اٹھالایا تھا وہ اس کا پیراہن تھا — ایک میلا سا پیراہن جو اس کے بدن پر رہ چکا تھا۔ یہ ہندوستانی کام کا ریشمی پیراہن تھا جس میں سے اس کے بدن کی مہک، موگرے کے عطر کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور وہ اس کے بدن کی گرمی اور اس کی ہستی میں سے کچھ اپنے میں بسا لے آیا تھا۔ میں اسے دیر تک سونگھتا رہا اور پھر ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر سو گیا۔ میں کسی رات اتنی راحت کے ساتھ نہیں سویا تھا۔ صبح سویرے ہی اپنی بیوی کے شور وغل سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے پیراہن کے گم ہو جانے پر چیخ چلا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی: ''بالکل نیا نکور پیراہن،'' حالانکہ اس کی آستین مسکی ہوئی تھی۔ لیکن چاہے میری جان چلی جاتی، میں اسے واپس کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کیا میرا اپنی بیوی کے ایک پرانے پیراہن پر بھی حق نہیں؟

آیا میرے لیے گدھی کا دودھ، شہد اور تافتان لے کر آئی تو ایک ہڈی کے دستے والی چھری بھی سینی میں رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ یہ چھری بوڑھے بساطی کے پاس دیکھ کر خرید لائی ہے۔ پھر بھنویں اٹھا کر کہنے لگی، ''کبھی نہ کبھی کام آ جائے گی۔'' میں نے چھری کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ وہی میری چھری تھی۔ پھر آیا شاکی اور رنجیدہ ہو کر بولی، ''صبح لڑکی کہہ رہی تھی کہ تم نے کل رات میرا پیراہن چرا لیا۔ میں تم لوگوں کی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتی، لیکن کل تمھاری بیوی کو خون بہہ رہا تھا۔ میں جانتی ہوں، بچہ ہے... خود کہہ رہی تھی کہ حمام میں ٹھہر گیا تھا۔ کل

میں نے اس کی کمر دبائی اور مالش کی تو اس کے بازو بالکل نیلے ہو رہے تھے۔ مجھے دکھا کر کہنے لگی: میں بے وقت تہہ خانے میں چلی گئی تھی۔'' پھر بولی، ''پتا نہیں تمھاری بیوی کب سے پیٹ سے تھی؟'' میں ہنستے ہوئے بولا، ''ضرور بچے کی شکل بوڑھے قاری کی شکل پر ہوگی۔ ضرور یہ اسی کا بچہ ہے۔'' آیا متغیر حالت میں کمرے سے باہر چلی گئی۔ لگتا تھا اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ایک دم اٹھ کر ہڈی کے دستے والی چھری کانپتے ہاتھوں سے صندوقچی میں رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا۔

''نہیں، یہ ممکن نہیں کہ بچہ مجھ پر گیا ہو۔ ضرور بوڑھے بساطی کی شکل کا ہوگا۔''

دوپہر کے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس حرافہ کا چھوٹا بھائی اپنا ناخن چباتا ہوا اندر آیا۔ کوئی بھی اسے دیکھتا تو پہچان لیتا کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ اتنے ہم شکل! چھوٹا سا تنگ دہانہ، بھرے بھرے تر اور شہوت انگیز ہونٹ، خمار بھری پلکیں، حیران آنکھیں، بے ترتیب بال اور گندم گوں رنگت — وہ بالکل اس حرافہ کی تصویر تھا اور اس میں بھی اسی کی شیطانی روح کا ایک حصہ تھا۔ اس کا چہرہ ان ترکمانوں کی طرح کا تھا جو زندگی کے جھمیلوں سے نمٹنے کے لائق ہوتے ہیں؛ وہ چہرے جو زندہ رہنے کے لیے ہر کام کو جائز سمجھتے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ فطرت نے ان دونوں کی پیش بینی کر لی تھی اور دھوپ اور بارش میں کھلی زندگی گزارنے والے ان کے جنگجو اجداد نے نہ صرف اپنی بدلی ہوئی شکل و شمائل انھیں دی تھی بلکہ اپنی استقامت، شہوت، لالچ اور بھوک بھی انھیں بخشی تھی۔ میں اس کے منھ کا ذائقہ جانتا تھا، بالکل ککڑی کے ڈنٹھل کی طرح تلخ اور ملائم تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنی حیران ترکمانی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا اور بولا، ''شاہ جان کہہ رہی تھی کہ حکیم باشی نے بتایا ہے، تم مرنے والے ہو۔ اب جان چھوٹے گی۔ مرتے کیسے ہیں؟''

میں نے کہا، ''اس سے کہو، میں تو بہت دنوں کا مر چکا ہوں۔''

''شاہ جان نے کہا کہ اگر بچہ ضائع نہ ہو جاتا تو سارا گھر ہمارا ہوتا۔''

میں بے اختیار خشک، کھرکھراتی، رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں ہنس پڑا۔ مجھے خود اپنی آواز پہچان میں نہ آئی۔ بچہ ہراساں ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

تب میری سمجھ میں آیا کہ قصاب کیوں مزہ لینے کے لیے ہڈی کے دستے والی چھری بھیڑوں کی ران سے رگڑ کر صاف کرتا ہے — کچے گوشت کو کاٹنے کا کیف، جس میں مردہ خون اور لوتھڑے کائی کی طرح جمے ہوتے تھے اور کٹی ہوئی گردنوں سے قطرہ قطرہ زمین پر ٹپکتے تھے۔ قصاب کی دکان کے آس پاس منڈلانے والا کتا، اور دکان کے فرش پر پڑا بیل کا کٹا ہوا سر، جو اپنی تاریک آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے تکتا رہتا تھا، اور بھیڑوں کے سر جو اپنی ان آنکھوں سے جن پر موت کا غبار جم گیا تھا سب کچھ دیکھتے تھے، یہ سب بھی جانتے تھے۔

آخر میں سمجھا کہ میں بھی ایک چھوٹا موٹا خدا بن گیا ہوں اور لوگوں کی چھوٹی چھوٹی پست ضرورتوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ مجھے ابدیت اور ہمیشگی کا بہاؤ خود میں محسوس ہو رہا تھا۔ میرے لیے ابدیت اس سے عبارت تھی کہ نہر سورن کے کنارے اس حرافہ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہوں اور صرف ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے اس کے دامن میں سر چھپا لوں۔

ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں، اور وہ بھی عجیب طرح۔ میں خود سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میرے ہونٹ اس قدر بھاری ہو گئے تھے کہ ذرا سی جنبش نہ کرتے تھے۔ میں ہونٹ ہلائے یا اپنی آواز سنے بغیر محسوس کر رہا تھا کہ خود سے باتیں کر رہا ہوں۔

اس کمرے میں جو لمحہ بہ لمحہ قبر کی طرح تنگ اور تاریک ہوتا جا رہا تھا، رات اپنے وحشت ناک سایوں کے ساتھ میرے اردگرد چھا گئی تھی۔ دھواں دیتے چراغ کی روشنی میں پوستین اور عبا لپیٹے اور شال اوڑھے میرا سایہ دیوار پر ساکت تھا۔

میرا سایہ میرے اصل جسم سے زیادہ گہرے رنگ کا اور ٹھوس تھا۔ گویا بوڑھا بساطی، قصاب، آیا اور میری حرافہ بیوی، سب میرے ہی سائے تھے — سائے جن کے درمیان میں محبوس تھا۔ اس وقت میں ایک چیختے ہوے الو کی طرح ہو گیا تھا لیکن میری پکار میرے گلے میں اٹکتی تھی اور میں اسے خون کے لوتھڑوں کی شکل میں تھوک دیتا تھا۔ شاید الو بھی میری طرح سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دیوار پر میرا سایہ بالکل الو کی طرح لگ رہا تھا اور یہ سایہ جھک کر غور سے میرا لکھا پڑھ رہا تھا۔ یقیناً وہ اچھی طرح سمجھتا تھا — صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے گوشے سے جوں ہی اس پر نظر ڈالتا، ڈر جاتا۔

ایسی گہری اور سیاہ رات چھا گئی تھی جیسے میری زندگی پر چھائی ہوئی رات۔ وہ خوفناک ہیولوں سے بھری ہوئی تھی جو در و دیوار اور پردوں کے پیچھے سے میرا منھ چڑا رہے تھے۔ کبھی میرا کمرہ اس قدر تنگ ہو جاتا جیسے میں تابوت میں پڑا ہوں۔ میری کنپٹیاں جلنے لگتیں اور اعضا ذرا بھی ہلنے جلنے کے قابل نہ رہتے۔ میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ دھرا تھا جیسے سیاہ لاغر گھوڑوں پر لدی ہوئی بھیڑوں کی لاشیں، جو قصاب کو پہنچائی جاتی ہیں۔

موت آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی، ایک ہکلے شخص کی طرح جو ہر کلمے کو بار بار دہرانے پر مجبور ہو اور ایک مصرع ختم کرتے ہی اسے پھر نئے سرے سے شروع کرتا ہو۔ اس کی آواز میرے گوشت میں آرے کی طرح اترتی چلی جاتی۔ چیخ بلند ہوتی اور پھر ناگہاں گھٹ جاتی۔

ابھی میری آنکھیں بند نہ ہوئی تھیں کہ نشے میں دھت سپاہیوں کا دستہ کمرے کے پیچھے سے پھر گزرا۔ وہ ایک دوسرے سے گندے مذاق کرتے ہوے مل کر گا رہے تھے:

چلو کہ چل کے مے پییں

شرابِ ملکِ رے پییں

میں نے خود سے کہا، ''آخر تو داروغہ کا ہاتھ مجھ پر پڑے گا ہی۔'' اچانک میں نے خود میں ایک ماورائے بشر قوت محسوس کی۔ میرا ماتھا ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اٹھ کر زرد عبا کاندھوں پر ڈالی،

گردن کی شال کو دو تین مرتبہ سر کے گرد لپیٹا، کمر جھکائی اور صندوقچی میں سے ہڈی کے دستے والی چھری لے کر اس حرافہ کے کمرے کی طرف چلا۔ اس کا کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے بڑی دقت سے، کان لگا کر اس کی آواز سنی، وہ کہہ رہی تھی:

''تم آ گئے؟ اپنی شال اتار دو۔''

اس کی آواز میں ایک خوشگوار گونج تھی جیسی بچپن میں ہوا کرتی تھی۔ یہ آواز میں نے پہلے گہری نیند کی حالت میں سنی تھی جیسے کوئی سوتے میں سرگوشی کر رہا ہو۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی تھی؟ اس کی آواز مسرت سے بھاری ہو رہی تھی، بالکل اس لڑکی کی طرح جو نہر سورن کے کنارے میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ میں نے ساکت کھڑے ہو کر پھر سنا: ''آؤ اپنی شال اتار دو۔''

میں اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اپنی عبا اور شال اتاری اور پھر باقی کپڑے بھی۔ لیکن نہ جانے کیوں چھری ہاتھ سے چھوڑے بغیر میں بستر میں چلا گیا۔ اس کے بستر کی گرمی ایسی تھی کہ میرے جسم میں نئی جان پڑ گئی۔ پھر اس کے گوارا، گرم اور نمناک بدن کو جو نہر سورن کے کنارے میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے والی چھوٹی سی لڑکی کی یاد دلاتا تھا، اپنی آغوش میں لے لیا۔ نہیں، میں نے ایک بھوکے درندے کی طرح اس پر حملہ کیا اور دل کی گہرائی سے اس کے لیے نفرت محسوس کی۔ مجھے لگا کہ عشق اور کینہ جڑواں احساس ہیں۔ اس کے خنک مہتابی بدن، میری بیوی کے بدن نے ایک بار کھل کر مجھے اس طرح جکڑ لیا جیسے ناگ اپنے شکار کے گرد کنڈلی مار لیتا ہے۔ اس کے سینے کی خوشبو مست کرنے والی تھی، میری گردن سے لپٹے اس کے بازو کا گوشت نرم اور گرم تھا۔ میں نے آرزو کی کہ میری زندگی ختم ہو جائے کیونکہ اس لمحے میرے دل میں اس کے لیے جتنی نفرت اور کینہ تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے خود کو رونے سے بمشکل روک رکھا تھا۔ ان جانے میں اس کے پیروں نے سورج مکھی کی طرح میرے پیروں کو جکڑ لیا تھا اور اس کے ہاتھ مضبوطی سے میری گردن کے پیچھے جمے ہوئے تھے۔ میں اس کے تر و تازہ گوشت کی حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میرے جلتے ہوئے جسم کا ذرہ

ذرہ اس حرارت کو چوس رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے شکار کی مانند مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ خوف اور لذت کے احساس ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ اس کے دہن کا مزہ ککڑی کے ڈنٹھل کی طرح کسیلا تھا۔ اس گوارا دباؤ کے درمیان مجھے پسینہ آ گیا اور میں بے خود ہو گیا۔

چونکہ میرا جسم، میرے وجود کا ذرہ ذرہ مجھ پر حکمرانی کر رہا تھا اور بلند آواز میں اپنی فتح کا نغمہ گا رہا تھا، میں نے محکوم اور بے بس ہو کر اس چڑھتے ہوئے دریا میں خود کو ہوا و ہوس کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بال، جن سے موگرے کے عطر کی خوشبو اٹھ رہی تھی، میرے چہرے پر پڑے ہوئے تھے، اور ہمارے وجود میں سے اضطراب اور مسرت کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ناگہاں مجھے محسوس ہوا کہ اس نے زور سے میرا ہونٹ کاٹ لیا۔ یوں لگا جیسے وہ درمیان سے کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔ کیا وہ اپنی انگلی بھی یوں ہی کاٹتی تھی؟ یا وہ یہ جان گئی تھی کہ میں پھٹے ہوئے ہونٹ والا بوڑھا نہیں ہوں؟ میں نے خود کو الگ کرنا چاہا لیکن میرے لیے ہلنا جلنا ناممکن تھا۔ میں نے کتنی ہی کوشش کی مگر بیکار — ہم دونوں کا گوشت مل کر ایک ہو گیا تھا۔

میرا خیال ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ کش مکش کے دوران میں نے بے اختیار ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا اور محسوس کیا کہ چھری جو میرے ہاتھ میں تھی، اس کے جسم میں کہیں اتر گئی ہے۔ میرے چہرے پر کوئی گرم سیال بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک چیخ مار کر مجھے رہا کر دیا۔ گرم سیال جو میری مٹھی میں آ گیا تھا اسے میں نے اسی طرح بھینچے رکھا اور چھری کو دور پھینک دیا۔ اپنا ہاتھ آزاد کر کے میں نے اس کے بدن پر پھیرا جو بالکل سرد تھا — وہ مر چکی تھی۔ تب ہی مجھے کھانسی کا دورہ پڑا؛ لیکن یہ کھانسی نہیں تھی، خشک اور کھرکھراتی ہنسی تھی جو آدمی کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ میں نے ہراساں ہو کر عبا اپنے کاندھوں پر ڈالی اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ چراغ کی روشنی میں میں نے مٹھی کھولی، دیکھا اس کی آنکھ میرے ہاتھ میں تھی، اور میرا پورا جسم خون میں لت پت تھا۔

میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا، لیکن خوف کی شدت سے میں نے ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ میں بالکل اسی بوڑھے بساطی کی شبیہ... نہیں، بالکل وہی ہو گیا تھا۔ میرے سر کے بال اس شخص کے بالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے جو ناگ کے ساتھ ایک غار میں بند رہنے کے بعد باہر نکلا ہو۔ میرا ہونٹ بوڑھے کے ہونٹ کی طرح پھٹ چکا تھا، پلکیں جھڑ گئی تھیں اور میرے سینے سے مٹھی بھر سفید بال جھانک رہے تھے۔ میرے جسم میں کوئی اور ہی روح حلول کر گئی تھی اور میں بالکل اور ہی طرح سوچنے لگا تھا۔ میں خود کو اس دیو کے ہاتھ سے جو مجھ میں بیدار ہو گیا تھا، چھڑا نہ سکتا تھا۔ ہاتھ چہرے پر رکھے رکھے میں بے اختیار ہنس پڑا — پہلے سے بھی زیادہ زور کی ہنسی جس سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا؛ ایسی گہری ہنسی جو نہ معلوم میرے بدن کی کس انجانی گھاٹی سے اٹھ رہی تھی، خالی پن میں سے نکلتی ہوئی، گلے میں گونجتی ہوئی کھوکھلی ہنسی... میں بوڑھا بساطی بن چکا تھا۔

شدتِ اضطراب سے یوں لگتا تھا جیسے ایک لمبی گہری نیند سے جاگا ہوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ میں اسی اپنے پرانے کمرے میں تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور کھڑکی کے شیشوں پر کہرا جما ہوا تھا۔ دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ میرے سامنے انگیٹھی میں انگارے سرد ہو کر راکھ بن گئے تھے۔

پہلی چیز جو میں نے ڈھونڈی، راغہ کا گلدان تھا جو میں نے اس گھوڑا گاڑی والے بوڑھے سے لیا تھا۔ لیکن گلدان میرے سامنے نہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دروازے کے پاس جھکے ہوئے سائے والا ایک بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ نہیں، یہ ایک خمیدہ پشت بوڑھا تھا جس کا سر اور چہرہ گردن کی شال میں لپٹے ہوئے تھے اور کوئی چیز گندے سے رومال میں لپیٹ کر اس نے بغل میں داب رکھی تھی۔ وہ ایسی خشک اور کھرکھراتی آواز میں ہنسا کہ آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

جوں ہی میں نے اپنی جگہ سے ہلنا چاہا، وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر اس کے پیچھے جاؤں اور وہ کوزہ جسے اس نے رومال میں لپیٹ رکھا تھا اس سے لے لوں، لیکن بوڑھا اپنی مخصوص پھرتی سے دور پہنچ چکا تھا۔ میں نے واپس آ کر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کھولی۔ بوڑھے کا جھکا ہوا ہیولا گلی میں جاتا نظر آیا۔ ہنسی کے زور سے اس کے کندھے لرز رہے تھے، اور رومال میں لپٹی ہوئی چیز اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔ وہ افتاں وخیزاں چلتا

رہا، یہاں تک کہ کہرے میں بالکل غائب ہو گیا۔

میں نے خود پر نگاہ ڈالی، دیکھا کہ میرا لباس پارہ پارہ ہے اور میں سر سے پاؤں تک خون کے لوتھڑوں میں لت پت ہوں۔ دو بڑی سنہری مکھیاں میرے آس پاس اُڑ رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے میرے جسم پر چل پھر رہے تھے... اور ایک لاش کا بوجھ میرے سینے پر رکھا تھا۔

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

شاعری

کتاب	شاعر		قیمت
پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیرطبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیرطبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120
ریت پہ بہتا پانی	قاسم یعقوب		Rs.160
زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی	تنویر انجم		Rs.350
بے یقین بستیوں میں	علی اکبر ناطق		Rs.150

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت :80روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت :90روپے

انیس
(سوانح)
قیمت:375روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت:280روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت:70روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت:150روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت:200روپے

افسانے کی تلاش
(تنقیدی مضامین)
قیمت:240روپے

ادبستان
(نثری ادب)
قیمت:140روپے

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

لغاتِ روزمرہ
(اردو میں زبان کے غیر معیاری
استعمالات کی فہرست)
قیمت:250روپے

سوار اور دوسرے افسانے
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت:350روپے

ساحری، شاہی، صاحب قرانی
(داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ)
جلد اوّل تا سوم
قیمت:1110روپے

آسماں محراب
(شاعری)
۱۹۷۶ سے ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب
قیمت:315روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں
(ناول)
قیمت:600روپے

تنقیدی افکار
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت:250روپے

افسانے کی حمایت میں
(نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت)
قیمت:240روپے

The Colour of Black Flowers
(Selected Poems)
قیمت:250روپے

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

s.200R

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب .

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

شاعری

ریت پہ بہتا پانی
قاسم یعقوب
قیمت:160روپے

خودکشی کے موسم میں
زاہد امروز
قیمت:120روپے

مٹی کی کان
افضال احمد سید
قیمت:500روپے

مٹی کا مضمون
فرخ یار
قیمت:150روپے

سویرے کا سیاہ دودھ
پاؤل سیلان؛ ترجمہ: آفتاب حسین
قیمت:150روپے

جنگ کے دنوں میں
ذی شان ساحل
قیمت:125روپے

ای میل اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
قیمت:150روپے

نیم تاریک محبت
ذی شان ساحل
قیمت:100روپے

بے یقین بستیوں میں
علی اکبر ناطق
قیمت:150روپے

زندگی میرے پیروں سے لپٹ جا
تنویر انجم
قیمت:350روپے

صادق ہدایت

بوف کور

شہر کے نواح میں ایک خستہ و درماندہ شخص اپنی زندگی اور تخلیق کے کابوس کو کاغذ پر منتقل کر رہا ہے تاکہ خود کو پہچان پانے سے پہلے مر نہ جائے۔ اپنی تلاش کا یہ آسیب اسے [illegible] ہوئی ایک تاریک اور عجیب دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وجود انسانی کے ناقابل علاج زخم تازہ ہیں۔ ڈراؤنے خوابوں کی یہ دنیا ایڈگر ایلن پو کی دنیا سے مماثل ہے اور اس کی تعبیر وجودیت کے فلسفے کی مدد سے بھی کی جاتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اہم ناول، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک زندہ دستاویز اور فنی معیار کے لحاظ سے ایک مکمل شہ پارہ ہے، جدید فارسی ادب کو ادب عالیہ کے بڑے دھارے سے جوڑ دیتا ہے۔

اس ناول کے مصنف صادق ہدایت کو متفقہ طور پر فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ ہدایت ۱۹۰۳ میں تہران میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۰ میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ہدایت کی دوسری تصانیف میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (''قضیہ'')، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر اس کی شدید طنز آمیز تحریر ''توپ مرواری'' اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ تاہم ''بوف کور'' کو ہدایت کا اہم ترین ادبی کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی [illegible] شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس تاریک طرز احساس کی جھلکیاں اس کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اپنے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایران میں جینے مرنے سے بالکل بیزار ہو کر ۱۹۵۰ میں فرانس چلا گیا اور اپریل ۱۹۵۱ میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

اس اردو ترجمے کے لیے ناول کے اصل فارسی متن کے علاوہ ڈی پی کوستیلو کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے The Blind Owl کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

Cover painting: Faiza



ISBN 969-8379-01-0
Rs.200